

www.urduchannel.in

اردو چینل

www.urduchannel.in

تلخ ترش شیریں

سعادت حسن منٹو

انتساب

حفیظ جاوید کے نام

## دیواروں پر لکھنا

کل ایک دیوار پر یہ حکم لکھا نظر آیا ”اس دیوار پر لکھنا منع ہے“ میں نے سوچا، جب دیوار کے مالک کو اپنی دیوار پر کسی قسم کی تحریر پسند نہ تھی تو یہ حکم ہی کیوں لکھوایا۔ غالباً اسی نفسیاتی غلطی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ساری دیوار بے شمار چھوٹے اور موٹے بد خط اور خوش خط حروف سے بھری ہوئی تھی۔ لیکن شہر کی قریب قریب ہر دیوار بغیر کسی نفسیاتی تحریک لکھنے لکھانے کا نشانہ بن رہی ہے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دیواروں پر لکھنا انسان کی فطرت میں داخل ہے جس طرح ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، اسی طرح دیواروں پر لکھتے بھی ہیں۔

میری بچی ہے ڈیڑھ برس کی۔ اس نے مجھے کانڈوں پر لکھتے دیکھا ہے لیکن جب اس کے ہاتھ میں پہلی بار پنسل آئی تو اس نے کانڈ کے بجائے میرے کمرے کی دیواریں ہی کالی کیں۔ وہ اس شغل میں مصروف تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دیواروں پر سیاہ لکیریں کھینچ کر ایک عجیب قسم کی تسکین محسوس کر رہی ہے۔ شروع شروع میں انسان اس تسکین و تفریح ہی کے لیے لکھتا ہے لیکن بعد میں اپنا پیٹ پالنے کے لیے لکھتا ہے۔ ابتداء میں تو اس کی تحریر صرف دیواریں کالی کرتی ہیں لیکن آگے چل کر اس کی تحریریں دیواریں بناتی بھی ہے اور ڈھاتی بھی ہے۔ کوئی چغتائی بن جاتا ہے اور کوئی اقبال۔۔۔۔۔۔ اور بعض دیواروں پر لکھ لکھ ایسی مصوری اور شاعری کرتے ہیں کہ جسے انسان دیکھ کر نقش بہ دیوار ہو جاتا ہے۔

کتابی ادب ہے، اخباری ادب ہے، رسائی ادب ہے اسی طرح دیواری

ادب بھی ہے۔ کاغذ پہ صرف یہ نتیجہ نکال کے رکھا جاسکتا ہے لیکن دیوار پر آپ کا بیج، گردے، دل پھیپھڑے سبھی نکال کر رکھ سکتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور منڈوؤں کے ہاتھ روموں میں جائیں۔ ان کی دیواروں پر آپ کو جملہ اعنائے نسوانی کی تصویریں نظر آ جائیں گی۔

دیواروں پر تو خیر انسان لکھتا ہی ہے لیکن بیت الخلاء کی دیواروں پر ضرور لکھتا ہے۔ مسجد میں چلے جائیں اس کے غسل خانے کی دیواروں پر بھی آپ کو ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصوری بکھری نظر آئے گی۔ یہی نہیں آپ ان دیواری تحریروں سے ضروری معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مسجد کے مؤذن صاحب کس طبیعت کے مالک ہیں۔ امام صاحب کو کون سے کمانے مرغوب ہیں۔ سکول کا کون کون سا استاد میر تقی میر کا تبع کرتا ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب مقبول ہیں یا نہیں۔ اسی طرح کی اور سینکڑوں باتیں آپ کو ایک ہی نشست میں ان دیواروں کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ایک کہانی کے سلسلے میں بمبئی کی ایک فلم کمپنی سے میرا معاملہ ہو رہا تھا۔ ایگریمنٹ پر صرف دستخط کرنے باقی تھے کہ مجھے ہاتھ روم جانا پڑا۔ سامنے دیوار پر زرد چاک سے یہ لکھا ہوا نظر آیا اور تو سب ٹھیک ہے لیکن پگاریوں نہیں دیتے؟ پگار کا مطلب ہے تنخواہ میں نے ایگریمنٹ پر دستخط نہ کئے۔ اس فلم کمپنی میں اور سب ٹھیک تھا۔ ظاہری ٹیپ ناپ بالکل درست تھی لیکن کام کرنے والوں کو چھ مہینے سے تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔

دیوار پر لکھنا ایسا ہی ہے جیسے سر بازار آواز بلند کر کے کوئی اعلان کر دیا جائے

لیکن بیت الخلاء کی دیواروں پر وہ علوم لکھے جاتے ہیں جن کے مطالعے کے لیے سکون تہائی اور اطمینان قلب درکار ہوتا ہے۔ مختصر نشست ہی میں آپ ان چھوٹی چھوٹی انگریزیوں سے روزمرہ کی زندگی کے سینکڑوں اسرار معلوم کر سکتے ہیں۔ بھاری بھرکم کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ ذرا گردن اٹھائی اور ہیولک ایلس کی چاروں جلدوں کا نچوڑ دیکھ لیا۔

نالب کا ایک شعر ہے

پڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق  
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

چونکہ ایسی دیواروں پر لکھتے وقت دم تحریر فرشتے نہیں ہو سکتے اس لیے پڑنے پڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دیواری ادب اور مصوری کی یہ شاخ حکومت کے احتساب اور اس کے خوف سے بالکل پاک رہی ہے۔ انسان ان دیواروں پر تعزیرات کی تمام دفعات سے محفوظ ہو کر اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تمام ملع کاریوں سے مبرا۔

اسی چار دیواری کے ایک کونے میں عرصہ ہوا یہ فکر خیز تحریر دیکھی تھی ”تمہارے ہاتھ بھی کیسے کیسے کام کرتے ہیں“ اور دیواری مصوری کی اس خاص صنف میں آج کے نقاد ماڈرن سوئی ری لٹک مصوری کی نمایاں جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

دیواروں پر لکھنے اور نقش و نگار بنانے کے لیے خاص روشنائی یا رنگوں کی ضرورت نہیں۔ کونلا، کھریا، مٹی، نیم پختہ اینٹ کا ٹکڑا، دودھ پتھری، گیری، چونا، کتھا، تار کول ان میں سے جو بھی Inspiration کے وقت موجود ہو۔ آپ

استعمال کر سکتے ہیں۔ قلم اور برش نہیں تو انگلی ہی سے کام لیا جاسکتا ہے اور اگر کوئی بھی ذریعہ میسر نہیں تو ناخنوں ہی سے کرید کرید کر آپ اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔

فارسی محاورہ ہے۔ دیوار ہم گوش وارد، لیکن جب دیواروں پر لکھا جاتا ہے تو اس کے کانوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے اصل میں دیوار کے کانوں ہی میں سرگوشیاں کرتے ہیں تاکہ کان کی یہ کچی چیزیں جو کچھ سنیں دوسروں تک پہنچائیں۔

عرصہ ہوا لاہور سے پشاور تک سفر کرتے ہوئے فرنیٹر میبل کے ایک ڈبے کی چوٹی دیوار پر میں نے یہ تحریر دیکھی تھی ”بجلی کے تاروں پر ابا بیلوں کے جوڑے بیٹھے ہیں لیکن میرا پہلو خان ہے، مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا“ ڈیڑھ مہینے کے بعد اتفاق سے لاہور واپس آتے ہوئے مجھے اسی ڈبے میں جگہ ملی۔ اس عبارت کے نیچے لسانی خط میں یہ الفاظ لکھے تھے ”بد نصیب ہے وہ انسان جس کا دل محبت سے خالی ہے۔“

کیا جب کہ یہ دونوں دل جو محبت سے خالی تھے ایک روز وقت کے تاروں پر مل بیٹھے ہوں۔

ہوٹلوں میں آپ نے اکثر دیواروں پر یہ شعر دیکھا ہوگا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اگر آپ غریب الوطن ہیں تو یہ تحریر دیکھ کر یقیناً آپ کا دل محزون ہو جائے گا

دیواروں سے بعض اصحاب ڈائری کا کام بھی لیتے ہیں۔ ٹیلی فون کے برابر کی

دیوار پر آپ نے کئی نمبر اور نام یادداشت کے طور پر لکھے ہوئے دیکھے گے۔ ہاسٹل کے کمروں کی دیواروں پر ایسی تحریریں عام دکھائی دیتی ہیں۔ 2-6-45 کو دودھ شروع کیا گیا۔ دستوئی کو کپڑے دینے گئے 4-7-45

بمبئی کے ایک ہوٹل میں جہاں نام طور پر جہاز کے خلاصی ٹھہرتے تھے۔ میں نے بادبانوں، مستولوں اور جھنڈوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ذیل کی تحریریں دیکھیں جو اپنا مطلب خود واضح کرتی ہیں۔

کل من علیہما فان

فرانس، فرانس، فرانس میوزیل نمبی

ہائے!

سیرت کے ہم گلام ہیں سورت ہوئی تو کیا

پانچوں وقت نماز پڑھا کرو

اوجانے والے بالو الوٹ کے آ، الوٹ کے آ

بقلم خود جان محمد 4-9-47

بقلم خود لکھنے کا شوق بہت زیادہ ہے شاید اس لیے کہ اس سے وقتی طور پر انسان کو خودی کی تسلی ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہمالہ کی چوٹیاں مسخر کرنے پر سیاح اپنے جھنڈے گاڑ آتے ہیں۔ اسی طرح کوئی نئی جگہ دیکھنے پر ہم چھوٹے چھوٹے انسان اپنا نام لکھ آتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی قطب صاحب کی الاٹھ کی آخری منزل تک پہنچنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں تانبے کے کڑے اور پتھروں پر ہزاروں بقلم خود کندہ ہیں۔ امریکی، روسی اور انگریز سپاہیوں نے جب

رائخ شھاگ کی نمارت پر قبضہ کیا تو اس کی دیواروں پر اپنا نام لکھنے میں فاتحانہ مسرت محسوس کی۔

دیواروں پر قسمت بھی آزمائی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ہوٹلوں، گھروں اور سکولوں کی دیواروں پر چار لکیروں میں گھرے ہوئے چلیپا کے نشان اور دائرے اکثر دیکھے ہوں گے۔ حساب کے سوال بھی حل کئے جاتے ہیں۔ سیاست کی گھنٹیاں بھی سلجھائی جاتی ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالی جاتی ہے۔

مجھے مشہور ریاضی شاک مار کے ہاتھ روم میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کی ایک دیوار پر بے شمار گیمبوٹوں کے نام، ان کے وزن اور بینڈی کیپ وغیرہ لکھے تھے۔ اشوک نے مجھ سے کہا کہ ریس میں جانے سے پہلے وہ اسی دیوار پر سے اپنے لیے ٹپ نکالا کرتا ہے۔

قلو پطربہ کو ابھی بیٹھارس لگا تھا جب سکندر یہ میں یہ رواج نام تھا کہ عشاق اپنی پسندیدہ عورت کا نام دیوار پر لکھ دیتے تھے۔ اپنا نام پڑھ کر عورت سواہ سنگھار کئے اپنے عاشق کے انتظار میں وہاں کھڑی رہتی تھی۔ انسان کے دیواروں پر لکھنے اور نقاشی کرنے کے اس فطری شوق ہی کی بدولت اتھینا اور ایلورا کے فرسکو نظر آتے ہیں۔ اس کی معراج دیکھنا ہو تو روما کے عظیم الشان کھنڈوں کی دیواروں کے نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھنے تو یورپ کے فن مصوری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں کو نہ مٹنے والے نقش موجود ہیں۔ سچ پوچھنے تو یورپ کے فن مصوری کا نصف بہتر آپ کو وہاں کی دیواروں پر ہی ملے گا اور مغلوں کی بے مثل خطاطی، نقاشی اور مصوری کے نمونے بھی دیواریں ہی پیش کریں گی۔



اشتہار بازی میں بھی تحریریں پیش پیش ہیں۔ شہر لاہور کی شاید ہی کوئی ایسی دیوار ہو جس پر آپ کو اشتہار لکھا ہوا نظر نہ آئے۔ بال صفا پاؤڈر سے لے کر اگانے کے تیل تک جتنی دوائیں ہیں۔ آپ ان کا اشتہار دیواروں پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ پطرس صاحب نے اپنے مشہور مضمون ”لاہور کا جغرافیہ“ میں دیواروں کی سطح پر لکھے ہوئے اشتہاروں کے فوائد بیان کئے ہیں۔

ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ چھپلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹنے تک وہاں اہل لاہور کو تازہ اور سستے جنوں کا مشہور سنا یا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی ”محمد علی دندان ساز“ لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے جہاں ”بکلی، پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال“ لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں خالص گھگی کی مٹھائی اتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ کرشنا بیوٹی کریم شمالا مارباغ کو اور ”کمانسی کا مجرب نسخہ“ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

بمبئی میں کارپوریشن نے ایک بہت لمبی دیوار جو کوئینز روڈ پر واقع ہے اور برقی ریل کی پٹری کے متوازی دور تک چلی گئی ہے۔ اشتہاروں کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ اس دیوار کے پیچھے پارسیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا قبرستان اور ہندوؤں کا شمشان ہے۔ معلوم نہیں مذہبی نقطہ نظر سے بمبئی کارپوریشن کی حرکت درست ہے یا نا درست مگر یہ دیوار جس پر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک فلموں کے بڑے بڑے اشتہار پینٹ ہیں، ایک عجیب و غریب تضاد پیش کرتی

ہے۔ عتب میں ہزاروں انسان دن میں لیکن پیشانی پر پری چہرہ نسیم بانو کی یہ بڑی تصویر نظر آتی ہے۔ ذرا آگے بڑھئے تو موئے موئے حروف ہیں ”ہنسواے دنیا والو“ کا اشتہار دکھائی دیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے جلتی ہوئی چتا سے دھواں اٹھ رہا ہے لیکن سامنے نیوٹھیئرز کے فلم ”زندگی“ کا شوخ رنگ اشتہار چمک رہا ہے۔

پچھلے دنوں ایسٹریڈ ویلکی آف انڈیا میں اسی دیوار کو متعدد رنگین تصویریں ایک مضمون کے ساتھ شائع ہوئی تھیں جس میں اشتہاری مصوری کی اس جدید صنف کو بہت سراہا گیا تھا۔ لیکن بچپن میں ہم جب چھوٹی چھوٹی گلیریاں، دو تیریاں دو تیریاں کا دلچسپ کھیل کھیلتے تھے اور دیواروں پر کونلے سے ان گنت لکیریں کھینچتے تھے تو بزرگوں نے ہمارے اس فعل کو ہمیشہ مذمت کی۔

ادھر روس میں ان دیواروں تحریروں نے انقلاب میں بیٹس از بیٹس حصہ لیا۔ پریس پر حکومت کا بہت بڑا احتساب تھا اس لیے دیواروں ہی کے ذریعے سے اخباروں اور پمفلٹوں کا کام لیا گیا۔ اس ذریعے نے بعد میں شکل بدلی اور مزدوروں کا ”دیواری اخبار“ یا ”وال پیپر“ بن گیا۔

جب تک دیواریں سلامت ہیں ان پر انسان لکھتا اور نقش و نگار بناتا ہی رہے گا لیکن پچھلے دنوں اس نے ایک قدم ترقی کی طرف بڑھایا اور فضاؤں پر لکھنا شروع کیا۔ بیئر سوپ بنانے والوں نے ایک ہوا بازی کی خدمت حاصل کی جس نے جہاز کی دم سے گاڑھا دھواں چھوڑ کر کچھ اس طرح قلابازیاں کھائیں کہ فضاء میں اس صابن کا دھواں دھار نام کچھ عرصے کے لیے معلق ہو گیا۔

بمبئی میں جب اس فضائی اشتہار بازی کا مظاہرہ ہوا تو کارپوریشن نے بیئر ز

سوپ بنانے والوں سے فضا، استعمال کرنے کا کرایہ طلب کیا معاملہ عدالت تک پہنچا فیصلہ کارپوریشن کے حق میں ہوا کہ فضا، بھی اس کے حلقہ انتظام میں شامل ہے۔

☆☆☆☆☆

## ناک کی قسمیں

خدا نے جس طرح پانچ انگلیاں یکساں نہیں بنائیں اسی طرح انسانوں کی ناک بھی ایک سی نہیں بنائی بعض چپٹی ہوتی ہیں، بعض اونچی، کچھ موٹی، کچھ پتلی چھوٹی اور لمبی اور بعض اوقات اتنی لمبی کہ

آئی جو ان کی ناک تو آتی چلی گئی

اس ناک کے مقابلے میں چھلکی سی ناک ہوتی ہے۔ چہرے پر جو صرف ناک کے نشان کا کام دیتی ہے۔ ایسی ناکوں کے مالک بڑے کٹر قسم کے رجائی ہوتے ہیں کیونکہ وہ اسی امید کے سہارے سانس لیتے رہتے ہیں کہ ایک روز صبح اٹھتے ہی یہ بے معلوم سانسٹان ستواں ناک میں تبدیل ہو جائے گا۔

عام استعمال میں سپلوں یعنی پھولی ہوئی چپٹی بیٹھی ستواں اور اونچی ناک ہی آتی ہے لیکن شاعروں کو صرف ستواں ناک ہی بھاتی ہے۔ کبھی اسے اپنی تلوار سے تشبیہ دی جاتی ہے، کبھی کتار یعنی امان کی پھلی سے۔ لیکن تلوار اور ناک کا رشتہ کچھ زیادہ ہی استوار ہی اس لیے کہ دشمنی کے وقت تلوار ہی اس کے درپے ہوتی ہے۔ دشمن کی ناک کاٹنے کا تو رواج عام ہے۔

یونپنی کے دیہاتوں میں خوبصورت ناک کو سوائے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے ہمارے سبزہ باغ میں سواچونچ کہتے ہیں شاید نظر کے تیروں کے علاوہ وہاں ناک کے سوائے بھی عاشقوں کے دل میں پیوست ہوتے ہیں۔

پنجابی شاعر تشبیہ دینے کے معاملے میں ہمیشہ ترقی پسند رہے ہیں۔ چنانچہ

ایک شاعر نے کہا ہے ”نک محمود دی تری“ یعنی ناک حسن کی ٹری ہے ہو سکتا ہے شاعر نے اپنے معشوق کے چہرے کو پکی ہوئی دال سمجھ کر لہسن کا بگھار دے دیا ہو۔ پنجابی شاعری کے ناخدا حضرت وارث شاہ پنجاب کی مثالی مشوقہ بیر سیال کا سراپا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ہونڈ سرخ یا قوت جیویں لال چمکن، ٹھوڈی سیب والایتی  
ساروچوں

نک الف حسینی دا پہلے، زلف ناگ خزانے دی باروچوں  
بیر کی اس ناک کو اگر گرانی تلوار، اہلی کی پھلی، لہن کی ٹری اور سونے میں خلط  
مלט کر دیا جائے تو چغتائی ناک بن جاتی ہے۔ خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کے مو  
تلم کی ایجاد سے دیکھ کر اللہ اور اس کے بندے، دونوں کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔  
شروع شروع میں ناک کا مصرف سوگھنا تھا چنانچہ حیوانوں میں ابھی تک اس کا  
ذوق صحیح موجود ہے۔ کتے اپنے روزمرہ کی زندگی میں زیادہ تر قوت شامہ جی سے  
کام لیتے ہیں لیکن چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس نے جو تے اور  
کپڑے سوگھنا متروک قرار دیا اور اپنے لیے عریات بنا لیے۔ چنانچہ اونچی سوسائٹی  
میں لونڈر اور سینٹ کے انتخابات ہی سے انسان کے مذاق کی بلندی و پستی کا اندازہ  
کیا جاتا ہے۔

ناک سوگھنے جی کے لیے تھی اور کسی حد تک اب بھی ہے لیکن اب اس کے اور  
استعمال بھی نکل آئے ہیں عورتیں ایک زمانہ سے اسے چھدوا رہی ہیں۔ شروع  
شروع میں دونوں طرف بڑے سوراخ کرانے اور بڑی بڑی تختیں پہننے کا رواج

تھا۔ آہستہ آہستہ ایک سوراخ جسے بے کہتے ہیں کم ہوا اور ساتھ ہی ساتھ نتھوں کا سائز بھی چھوٹا ہو گیا۔ اونچی سوسائٹی میں ان دنوں ناک چھدوانے کا رواج بہت محبوب ہے۔ ایک ازدواجی اشتہار ملاحظہ ہو:

”ضرورت ہے ایک اونچے گھرانے کی ناکتھہ تعمیر یا فیتہ خوش شکل لڑکی جس کی ناک چھدی ہوئی نہ ہو۔“

اونٹوں کی اونچی نیچی سوسائٹی میں ایسی کوئی پابندی نہیں چنانچہ ناک چھدوانے اور ٹیکل پہننے کا رواج ان کے ہاں عام ہے۔

عورتوں کی ناک کے حسن کی افزائش کے لیے بے شمار زیور ایجاد ہوئے جن میں نتھ، کیل، باک، (یہ ناک کی درمیانی دیوار کو چھید کے پہنا جاتا ہے) اور لونگ مشہور ہیں۔

ایک ”لونگ پہنی ٹیار“ کے بارے میں پنجاب کے کسی دیبانی کی یہ بولی بہت مشہور ہے۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا

تے ہالیاں نے ہل ڈک لے

تیری لونگ نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اس خیال سے اپنے ہل روک لیے کہ بجلی چمکی ہے ممکن ہے بارش ہونے لگے

بعض ناکوں کو زیور کی حاجت ہی نہیں ہوتی ایک شاعر کہتا ہے

ناک میں نیم کا فقط تنکا

شوخی چالاکي افتخا سن کا

پچھلے پچاس ساٹھ برس سے ناک کا ایک اور بھی مصرف معلوم ہوا ہے چنانچہ آنکھوں کی بینائی درست کرنے کے لیے جب عینک ایجاد ہوئی تو اسے ناک پر بٹھا دیا گیا۔ سیدھا راستہ بتانے میں تو عام طور پر اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ”ناک کی سیدھ چلے جائیے“

پر امری سکول میں جب کسی استاد کو اپنے شاگرد کے طمانچہ لگانا ہوتا ہے تو وہ سہولت کی خاطر اپنا ہاتھ گال پر اچھی طرح جمانے کے لیے اس کی ناک دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ہمارے پر امری سکولوں کے استاد کی اس سچ سے ابھی تک استفادہ نہیں کیا گیا۔ ایران میں البتہ جب کسی معتوب کو محفل سے باہر نکالنا مقصود ہو تو بیک بینی و دو گوش باہر نکالا جاتا ہے لیکن ہمیں تو ناک کی قسمیں بیان کرنی ہیں۔

بڑی ناک، اونچی ناک، پھلواں ناک، چپٹی ناک، بیٹھی ناک اور چھلکی سی ناک کا شمار جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، خوبصورت ناکوں میں نہیں ہوتا لیکن محاورے میں بڑی اور اونچی ناک کا مرتبہ بہت بلند ہے چنانچہ جب کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ بڑے نام والے، بڑی ناک والے ہیں تو ہمارا سر ہماری ناک سمیت احترام سے جھک جائے گا۔

بڑی اونچی ناک حسن کی علامت ہونہ ہو عزت کی نشانی ضرور ہے چنانچہ ایسی ناک پر کبھی بائبل نہیں بیٹھنے دی جاتی۔ اگر آپ کو کوئی ایسی ناک نظر آ جائے جس پر لکھیاں بجنھنار ہی ہوں تو آپ کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا مالک ذلیل و خوار آدمی ہے۔

ہاگوں کی مختلف شکل و صورت کے متعلق پروفیسر نامسن اور مسٹر بلکسنس بی ہماری رہبری کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تحقیق و تدقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اس عضو پر موسم خاص طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی تشکیل میں چنانچہ یہی کارفرما ہیں۔ پروفیسر نامسن کے نظریئے کے مطابق گرم اور مرطوب آب و ہوا میں رہنے والوں کی ناک اونچی ہوتی ہے لیکن پروفیسر صاحب اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ ایسی آب و ہوا میں رہنے والے باوقار اور باعزت لوگ ہوتے ہیں۔

تاریخی ناکوں میں دو ناکیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ناک تو وادی نیل کی معشوقہ قلو پطرحہ کی تھی جس کے متعلق یہ دیر تک سوچا جاتا رہا ہے کہ اگر یہ ایک انچ کا آٹھوں حصہ بڑی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی۔ قلو پطرحہ کی اس تاریخی ناک کو حیرت ناک کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے تصور ہی سے لوگ ورطہ حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں کہ ایک عورت کی ناک تو مومن کی قسمت میں کیلے ڈالنے کا باعث کیوں کر ہو سکتی ہے؟

دوسری ناک کو ہولناک کہتے ہیں یہ بھی مصر ہی کی پیداوار ہے اور ابوالبول کے سنگین چہرے پر حضرت مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کی بیٹھی ہوئی ہے۔

ان دو ناکوں کے علاوہ اور کوئی تاریخی ناک نہیں جس کا ہمیں علم ہو۔ عبرت ناک البتہ ہم نے اکثر آوارہ اور بدچلن عورت کے چہرے پر دیکھی ہے۔ غیرت مند شوہر جب بھی اپنی بدچلن بیوی کو سزا دیتا ہے۔ ایسی عبرت ناک معرض موجود میں آ جاتی ہے۔ ایسی ناکوں کو جنہیں سوسائٹی میں ہر قدم پر کٹ جانے کا خطرہ



لاحق رہتا ہے۔ خطرناک کہلاتی ہیں۔

تشویش ناک بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے لیکن جب نظر آجائے تو بعض دیکھنے والوں کی ناک کو تشویش پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں ہے تو ممکن ہے کہ ہونٹوں کی جنبش میں وہ خود ہی غائب ہو جائے۔ سکتے وقت جو ناک بہت شور مچائے، وہ شورش ناک کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔

نم ناک سے تو ہر ایک کو واسطہ پڑ جاتا ہے۔ نزلے اور زکام کی حالت میں اچھی، اچھی سے طرب ناک، نم ناک بن جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کی اپنی ناک مارے وحشت کے وحشت ناک ہو جاتی ہے۔

نئی نئی چھدی ہوئی ناک جس کی بے میں سوجن ہو درد ناک کہلاتی ہے اور رحم ناک اس ناک کو کہتے ہیں جو سردیوں میں اکیلے پڑی ٹھنڈی ہو جس کے دوسرے اعضا تو گرم گرم کپڑوں میں ڈھکے ہوں اور یہ بے چاری تن تنہا سردی کے طمانچہ کھا رہی ہو۔ ایسی ناک جسے دیکھ کر دل میں افسوس پیدا ہو کہ ہائے انسان کے چہرے پر ایسی ناک بھی ہو سکتی ہے۔ افسوس ناک کہلاتی ہے افسوس کی حد سے گزر جائے تو اندوہ ناک ہو جاتی ہے لیکن وہ خوبصورت ناک جو غضب ڈھا رہی ہو، غضب ناک کہلائے گی۔

فریب ناک عام طور پر طوائفوں کے چہرے پر پائی جاتی ہے۔ نتھنی کتنی دفعہ اتر چکی ہے اس کا پتا تماش بین حضرات کو ان ناکوں سے کبھی نہیں چلا۔ فریب کھا کر ان تماش بین حضرات میں سے اکثر کی ناک خشناک ہو جاتی وہ لگی لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے۔

مسنے کہ بعد از جنگ یا دمی آید بر بینی خود باید زد  
شرم سے عام طور پر انسان کی پیشانی عرق آلود ہوتی ہے لیکن اگر شرم کا  
احساس بہت ہی شدید ہو تو ناک پر بھی پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ایسی  
ناک کو شرم ناک کہا جائے گا اور وہ ناک جس کے تصور ہی سے خوف و ہراس طاری  
ہو جائے، خوف ناک کہا جائے جانے کی مستحق ہے۔

چکنی اور پمکیلی ناک کا شمار خاندانی ناکوں میں نہیں ہوتا۔ انگریزی سوسائٹی  
میں تو خاص طور پر ایسی ناک بہت ہی بری قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی چکنناہٹ  
اور چمک دور کرنے کے لیے آئے دن دوائیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے  
یہاں ایسی ناک کو تاناک کہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسری غیر پمکیلی ناکیں اب ان  
کی تاب نہیں آسکتیں۔

ایک ناک جو حال ہی میں مولانا چراغ حسن حسرت نے دریافت کی ہے خضر  
ناک ہے۔ خوبہ خضر کی بند ناک سے جس کے نتھنوں میں پانی کھستا ہی نہیں۔ اس ناک  
کا کوئی تعلق نہیں یہ ناک صرف ملک خضر حیات خاں ٹوانہ، سابق وزیر اعظم  
پنجاب کے چہرے پر ہے۔ سیاست کے اکھاڑے میں بہت بری طرح مکے اور  
گھونسے کھانے کے بعد آج کل یہ لندن میں اونچی ہونے کی کوشش کر رہی ہے  
لیکن پروفیسر نامسن اور مسٹر بکشن کی تحقیق کے مطابق سرد ملکوں میں ناک کے  
پینے کے کچھ زیادہ امکانات نہیں ہیں۔

برقیہ: یہ مضمون اشاعت کے لیے پریس میں جا رہا تھا کہ لندن سے ملک خضر  
حیات کا برقیہ موصول ہوا آپ لکھتے ہیں کہ مولانا چراغ حسن حسرت کی ناک کو ہر

گزر فراموش نہ کیا جائے کیوں کہ ایسی حسرت ناک و اٹیر کے بعد صرف انہی کے  
دصے میں آئی ہے۔

حسرت ان ناکوں پہ ہے جو بن کئے مرجھا گئیں

☆☆☆☆☆

## کھانسی پر

ہمارے یہاں جب کوئی طبیب اپنا کام شروع کرتا ہے تو بسم اللہ کر کے وہ سب سے پہلے مردوں کی قوت مردی کے لیے نسخہ ایجاد کرتا ہے جس کو مجرب ثابت کرنے کے واسطے وہ خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر ساری عمر اشتہار دیتا رہتا ہے۔ یورپ میں جب کوئی فرم دوا سازی کا کام شروع کرے گی تو وہ سب سے پہلے کھانسی کی تیر بہدف دوائی ایجاد کرے گی اور باپ بیٹے اور روح القدس کو حاضر ناظر جانے بغیر اس کے حیرت انگیز اثر کا اشتہار دیتی رہے گی۔

کھانسی کے لیے اب تک جتنی انگریزی دوائیاں ایجاد ہوئی ہیں اور کسی بیماری کے لیے نہیں ہوئیں۔ سنا ہے کہ یہ مرض بہت پرانا ہے اور سب سے پہلے اماں حوا کو ہوا تھا۔ تحقیق و تدقیق کرنے والے اس نظریے کے جواز میں عورت کے ترشی پسند جبلی میاں کو پیش کرتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت کھٹی چیزیں زیادہ رغبت سے کھاتی ہیں۔ تجربے کے طور پر اگر آپ مردوں اور عورتوں کی ملی محفل میں اپنی جیب سے امانی کی پھلی نکالیں تو سب سے پہلے عورتوں کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اس مرض کا آنا عورت سے ہوا تھا یا مرد سے اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں کیونکہ یہ بیماری آج کل دنیا میں کافی مقبول ہے اور امکان یہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں اس کی مقبویت ار بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ کھانسی سے شغف رکھنے والے ماہرین اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ ہم پرانی نسل کے مقابلے میں

زیادہ کھانستے کھنگارتے ہیں اور یہ بات بھی پایہ تصدیق کو پہنچ چکی ہے کہ کھانسی صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔

کھانسی کے بے شمار علاج ہیں طبیبوں کے لبوب ہیں۔ قرص ہیں، شرب ہیں، معجونیں ہیں، دھونیاں ہیں، جو شانداے ہیں، فقیریوں اور درویشوں کی چمکیاں، تعویذ اور ٹوٹے ٹوکے ہیں۔ ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک کی ہزار ہادواں ہیں اور اگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو پھانسی موجود ہے، نہ رہے بانس نہ بچے بانسری۔

عرصہ ہوا ایک شخص نے جو پھانسی کے پھندے سے بچ کا تھا۔ اپنے تجربے کے پیش نظر نظریہ ضرب المثل ایجاد کی تھی کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک اور شخص نے پھانسی کے پھندے سے بچ کر پریس کانفرنس میں اپنا بیان دیا ہے کہ کھانسی پھانسی پر بھی آ جاتی ہے ثابت ہوا کہ یہ بت بری بلا ہے اس لیے خداوند کریم کو چاہیے کہ وہ سب کو اس سے محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

لیکن جو شخص اس مرض میں لاحق ہو جائے اس کو سب سے پہلے اس کے رنگ و نسل پر غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ اس کی ایک نہایت ہی ادنیٰ ذات جسے کالی کھانسی کہتے ہیں، بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں گوری کھانسی کو لیجئے، بہت ہی بے ضرر قسم کی ہوتی ہے۔ جس طرح سفید فام انگریز، جس کو لاحق ہوتی ہے اسے زیادہ تکلیف نہیں دیتی۔ اس کا مریض ہولے ہولے کھانستا اور اسی طرح لگے بندھے سبتک کے اندر کھانستا کھانستا جاں بحق تسلیم ہو جاتا ہے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیتا ہے۔

حق مغفرت کرے جب آزاد مرد تھا  
اب کالی کھانسی کو لیجئے جسے حقارت کے طور پر پرتا کھانسی بھی کہتے ہیں۔ اس کا  
مریض دن کو تو خاموش رہتا ہے لیکن رات کو چونکہ دوسروں کو آرام کی نیند سونا ہوتا  
ہے، بھونکنا شروع کر دیتا ہے لیکن ہندوستانی اور پاکستانی گانگوں اور موسیقاروں  
نے بیک تان فیصلہ دیا ہے کہ کالی کھانسی اور کتے کی عاف صوفی اعتبار سے کوئی  
مماثلت نہیں رکھتی۔ کالی کھانسی کھانسنے والا دوسرے کالے سے شروع کرتا ہے اور  
کتا چوتھے کالے سے کتوں نے فی الحال اس معاملے میں اپنی رائے کسی موزوں  
وقت کے لیے محفوظ رکھ چھوڑ ہے لیکن کانوں میں اتنی بھنک ضرور پڑی ہے کہ وہ  
اپنی بدترین قسم کی کھانسی کا نام انسانوں کی کھانسی رکھنے کا ریزولوشن پاس کرنے  
والے ہیں۔

انسان رنگ و نسل کی تمیز حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا ہے لیکن اس کے  
جسمانی امراض میں رنگوں کی تمیز بدستور موجود ہے۔ کالا آزاد کو لیجئے، یرقان کو  
لیجئے۔ موخر الذکر کی بیماری بھی زرد رنگ ہونے کی وجہ سے گھٹیا قسم کی بیماریوں میں  
شمار ہوتی ہے۔ کالی کھانسی کا تو خیر کھانسیوں میں وہی درجہ ہوتا ہے جو ہندوؤں میں  
اچھوت کا ہوتا ہے۔ اسے کہتے تو اچھوت کی بیماری ہیں لیکن اس سے سلوک وہی روا  
رکھا جاتا ہے جو اچھوتوں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ چنانچہ کالی کھانسی کھانسنے  
والے انسانوں سے دوسرے رنگوں کی کھانسی کھانسنے والے بھی پرہیز کرتے ہیں  
اور ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کالی کھانسی چونکہ نیچ ذات ہے اس لیے عام طور پر اس کا حملہ کم سن بچوں پر ہوتا

ہے بے چارے مہینوں بستر پر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ کھانسی  
کھانسی کر ہاکان ہو جاتے ہیں۔ نموٹے پہ نموٹے آتے ہیں، اوپر کا سانس اوپر اور  
نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے مگر یہ کم بخت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا  
ہے کہ بچے اس کی تاب نہ لاکر ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ اگر بچہ کسی بڑے آدمی کا  
ہوتا ہے تو اخباروں میں مرض کے رنگ کی مناسبت سے سیاہ چوکھٹے کے اندر  
حادثہ جا زکامہ کے عنوان سے اس کی موت کا اعلان چھپ جاتا ہے اور یہ شعر لکھ دیا  
جاتا ہے۔

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کالی کھانسی کی ابتدا، سنا ہے افریقہ کے ایک حبشی نے کی تھی مگر حبشی نہیں مانتے

اس لیے کہ یہ دریافت سفید نسل کے ایک آدمی سے منسوب ہے۔

کھانسی کی بے شمار قسمیں ہیں۔ وقت و وقت کی بات ہوتی ہے اسی طرح وقت

وقت کی کھانسی ہوتی ہے لیکن بے وقت کی کھانسی بہت ہی بے ڈھب مانی گئی ہے۔

سب آدمی سو رہے ہیں۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ الماری

کھول کر اس میں سے کچھ روپیہ یا چند زیور نکال لیں۔ آپ کا حلق آپ کی نیت کی

طرح بالکل صاف ہے۔ خراش کا نام و نشان نہیں، پھیپھڑے بھی ماشاء اللہ ٹھیک

ٹھاک ہیں، گرد و غبار کا بھی کوئی امکان نہیں لیکن ذمعتہ آپ کے گھٹے میں گدگدی

شروع ہو جائے گی۔ اُلاکھ دبانے کی کوشش کریں لیکن یہ بن بلانی کھانسی آ کے

رہے گی۔

حلق اچھا بھلا صاف ہوگا۔ انخرے میں کسی قسم کی آائش نہیں ہوگی لیکن جب آپ تقریر کرنے کے لیے انھیں گے معزز حضرات! کھوں کھوں۔۔۔۔۔ معزز حضرات۔۔۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔۔۔ معزز حضرات کھوں کھوں۔

ایسے اوقات میں ایلو پیٹھک، ہومیو پیتھک اور یونانی طریقہ علاج کے تمام ماہرین نے متفقہ طور پر یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ تقریر کرنے والا اگر معزز حضرات کے آوازوں سے جانبر ہو جائے تو خودکشی کر لے۔

ایک کھانسی کا نظریہ یہ ہے۔ محمود ایاز صنف باندھے کھڑے ہیں۔ دھیان اللہ کی طرف ہے۔ ایک دم کچھ ہوگا اور محمود کے حلق سے کھوں نکل جائے گی۔ ایاز جو کہ چوتھی صف میں آخری سرے پر سر بیٹھوڑے کھڑا ہے۔ اپنے حلق میں نیلی پیٹھی محسوس کرے گا اور غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے بھی ایک عدد کھوں باہر سرک جائے گی۔ اس کا علاج القمان حکیم کے پاس بھی چونکا نہیں تھا اس لیے ازا ماخذ اوند حکیم کے پاس ہوگا۔

ایک کھانسی حقے کی کھانسی ہے۔ اس کو کھانسنے والے حضرات منہ اندھیرے اٹھ کر خدا کا نام لیتے ہیں نہ رسول کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا حنہ تازہ کرتے ہیں اور چلم بھروا کر اوپس کش لیتے ہیں کھانسنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کھانسنے کھانسنے منہ سرخ ہو جائے گا، گٹے کی رگیں ابھر آئیں گی، چھاتی دھونکی کی طرح چلنے لگے گی مگر وہ حقے کے بقے کھینچتے جائیں گے۔ ان حضرات کا بیان ہے کہ آدمی جتنا زیادہ کھانسنے اتنا ہی زیادہ ثواب ہوتا ہے۔



حقہ کھانسی کھانسنے والے جب بڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک ہی کش ان پر چودہ طبق روشن کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے چنانچہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلا کش لے کر یہ بزرگ ایک دفعہ کھوں کھوں کرتے ہی مراتب میں چلے جاتے ہیں اور تقریباً ایک گھنٹے تک اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رکھنے کے بعد دوسری کھوں کرنے کے لیے ہوش میں آتے ہیں۔

کھانسی برائے کھانسی ہے یا کھانسی برائے زندگی ہے۔ اس پر ایک زمانہ سے بحث ہو رہی ہے۔ دو سکول بن گئے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ انسان کو صرف کھانسنے ہی کے لیے کھانسا چاہیے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں انسان کو اپنی زندگی کے لیے کھانسا کھکارنا چاہیے۔ موخر الذکر کر سکول کے پیرو چنانچہ بسا اوقات لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کھانسی ہی سے کام لیتے ہیں۔ دوست جا رہا ہے، حلق سے تمبوڑی سی خرخر اہٹ پیدا کی ”کھوں کھوں کہیے جناب کیا حال ہے؟“

پاخانے میں محو اجابت دروازی میں کنڈی نہیں ذرا آہٹ ہوئی تو کھانس دیا مطلب یہ کہ نوہیمینسی!

دور کوٹھے پر کھڑی ایک عورت اپنے بال سکھا رہی ہے پیٹھ آپ کی طرف ہے جی چاہتا ہے کہ اس کی شکل دیکھی جائے گئے میں ذرا سر سر اہٹ پیدا کی اور تیکھی سی کھوں ہواں میں چیونک دی۔ یوں چنگلی بجاتے میں مطلب حل ہو جاتا ہے۔

آپ کے دوست کے ساتھ ایک عورت جا رہی ہے۔ معلوم نہیں اس کی بہن یا ماں۔ لیکن چونکہ آپ کو اس پر جتنا ہے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ جانے کی عیاشی کا مرتکب ہو رہا ہے اس لیے آپ باا تکلف ایک یا دو مرتبہ کھوں کر کے اپنا فرض

منصوبی ادا کر سکتے ہیں۔

ایک کھانسی خلاصہ گوپیوں کی کھانسی ہے جیسے فیشن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے محفل جمی ہوئی ہے آپ ہارمونیم کی پیٹی اپنے گانے والے دوست کی طرف بڑھاتے ہیں اور کچھ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں وہ ضرور اپنا ہاتھ گئے کی طرف لے جائے گا اور اسے دبا کر آپ سے کہے گا ”مجھے کئی دنوں سے کھانسی کی شکایت ہے کھوں کھوں دیکھ لیا۔“

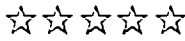
سنا ہے کہ میاں تان تین اور بیجو باورے نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی تھی کہ فرمائش پر فوراً ہی گانا شروع کر دینا ہا کا پن ہے اس لیے کھانسی اور زکام کی شکایت کا بیان کرنا لازم ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر سر غلط ہو جائے تو فوراً کھانسی کو محرم قرار دیا جاسکتا ہے۔

عادت پک کر طبیعت بن جاتی ہے چنانچہ گانے والے جب ریاض بھی شروع کرتے ہیں تو استاد کا نام لے کر ایک دو بار کھانسی کھنکار لیتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ کھاتے یا پیتے ہوئے ایک دم ایسی کھانسی اٹھتی ہے کہ اقمہ اور گھونٹ پھوں کر کے ناک، کان اور منہ کے رستے باہر نکل آتے ہیں اور پھر کچھ اس قسم کی کھوں کھاں شروع ہوتی ہے کہ آدمی سمجھتا ہے بس کام تمام ہوا لیکن دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر کام تمام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر کیا ہوتا ہے اس کے متعلق خواص عوام سے بہتر جانتے ہیں۔ کھانسی کے اس ناگہانی حملے کو اردوئے معلیٰ میں ”اچھو“ کہتے ہیں۔

کھانسنے کھنکارنے اور اس عمل سے بلوئے ہوئے باقم کے ذریعے سے فرشو

اور دیواروں پر پلستر کرنے اور تیل بولے بنانے کی صفت کسی زمانے میں ہمارے  
یہاں معراج پر تھی لیکن انگریزوں کی ایک سو سالہ حکومت میں اس سے اچھا سلوک  
نہ ہوا۔ پر اب کہ اتنا قدر بانیاں دینے کے بعد خدا کے فضل و کرم سے دنیا کی سب  
سے بڑی اسلامی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ ہمیں اس صحت مند صفت کو بام رفعت  
تک پہنچانے کے لیے مفرد و بھرکوشش کرنی چاہیے۔



## سوال پیدا ہوتا ہے

معزز خواتین اور معزز حضرات ذلیل عورتوں اور ذلیل مردوں، باادب با ملاحظہ ہوشیار!!۔۔۔ آپ سب کو بروقت آگاہ کیا جاتا ہے کہ ایک سوال پیدا ہو رہا ہے۔ جبوط آدم سے لے کر اب تک اتنے ہی سوال پیدا ہو چکے ہیں جتنے آسمان میں تارے ہیں لیکن پھر بھی آئے دن پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی اٹھ کر یا بیٹھ کر یہ نہیں کہتا کہ اب مزید سوال پیدا نہیں ہونے چاہئیں۔

آبادی کھٹانے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ بھونچال پیدا کرتا ہے، لڑائیاں پیدا کرتا ہے، قحط پیدا کرتا ہے، پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان پیدا کرتا ہے، برتھ کنٹرول کے نئے طریقے انسانوں کو سمجھاتا ہے مگر وہ سوالوں کی جمع در جمع اور ضرب در ضرب کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

سوال ہر جگہ پیدا ہوتا ہے اور ہر مقام پر پیدا ہو سکتا ہے اس کے لیے خاص موسم کی، خاص مٹی کی، خاص پانی کی، کھاد کی، ہل کی، ٹریکٹر کی، کوئی ضرورت نہیں، بچہ نومینے کے بعد پیدا ہوتا ہے لیکن سوال نطفہ قرار پاتے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے دایہ گیری کی حاجت نہیں میسٹری ہوم کی ضرورت نہیں کلورافارم درکار نہیں آؤڈیکیتا ہے نہ تاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

عدالت میں مجسٹریٹ حقتہ نبی رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ چرکیس کا دیوان مطالعہ کر رہے ہیں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مجرم پیش ہوتا ہے وہ مجسٹریٹ صاحب کو ساما نہیں کرتا فوراً تو بین عدالت کا سوال پیدا ہو جائے گا۔

آپ کو کوئی کام نہیں مل رہا۔ دو برس تک در بدر مارے مارے پھر نے اور  
فاتے کھینچنے کے بعد آپ نے تنگ آ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر شوقی قسمت  
سے ناکام رہے۔ قانونی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو کیوں اپنی جان لینے کے جرم  
میں سزا نہ دی جائے۔ میونسپلٹی نے دس میل لمبی ٹھنڈی سڑک بنائی اور صفائی کے  
پیش نظر ان دس میلوں میں کہیں بھی پبلک یورنیل نہ بنایا۔ ایک روز مٹانے نے  
آپ کو مجبور کیا اسے ہاکا کرنے کے لیے آپ زیر دیوار بیٹھے ہی تھے کہ پولیس کے  
سپاہی نے دیکھا لیا۔۔۔۔۔ ناٹا ناستہ حرکت کا سوال پیدا ہو گیا۔

آپ مقامی مہاجر ہیں۔ ایک پریس آپ کا راولپنڈی میں چلا رہا ہے دوسرا  
پشاور میں، رہائش آپ کی لاہور میں ہے۔ آپ درخواست کرتے ہیں اور ایک  
پریس لاہور میں اپنے نام الاٹ کرا لیتے ہیں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

آپ مہاجر ہیں جہاں سے آئے ہیں وہاں ایک بہت بڑے پریس کے مالک  
تھے۔ لاہور میں آپ کو کوئی پریس نہیں ملتا تنگ آ کر آپ شکایت کرتے ہیں کہ  
مقامی مہاجر کو پریس الاٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سوال پیدا ہو جائے گا کہ  
مقامی مہاجر آپ سے زیادہ اہل ہے اس لیے کہ اسے دو پریس چلانے کا محاورہ  
ہے۔ آپ کے گھر میں ایک مہینے کے اندر اندر چھ مرتبہ چوری ہوتی ہے آپ نے  
اس خیال سے پولیس کو اطلاع نہیں دی تھی کہ اسے ماحق تکلیف ہوگی مگر پولیس کو  
پتہ چل جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ آپ نے اہم ترین فرض میں  
کو تاہی کیوں برتی؟ سوال بے شمار پیدا ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پچھلی  
صدی میں سب سے خوف ناک سوال جو آئے دن پیدا ہوتا تھا۔ حضور ملک معظم کی



ہے؟۔۔۔۔۔ اگر مصلحت خاموشی میں ہے تو جو آدمی ذہین ہیں اور جنہیں عرف عام میں سیاست دان کہا جاتا ہے، یقیناً خاموشی ہی اختیار کریں گے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاموشی دوسروں کے ذہن میں تکلم کی صورت اختیار نہیں کرے گی؟۔۔۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان آدمیوں کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر دیا جائے، جن کے زرخیز دماغوں میں سیاست دانوں کی خاموشی تکلم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔۔۔ مگر ایک سوال پھر پیدا ہو جائے گا کہ ایسے آدمیوں کا خاتمہ جسے انگریزی کے عرف عام میں ”پرچ“ یعنی جلاب، کہا جاتا ہے کیا دوسرے لوگوں کے اذہان پر بھی قابض ہو جائے گا اور ان میں اس جلاب کا کوئی بھی رد عمل پیدا نہیں ہونے دے گا۔

ایک انسان یا ایک جماعت، ایک قوم پر بہت سی قوموں پر حکومت کرتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ محکموں کے دماغ میں سوال کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ بس اس فرد واحد یا اس جماعت کا جی چاہتا ہے کہ حکومت کرے اور حکومت کے کرنے کے لیے قواعد و ضوابط بھی کون سے مقرر ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دماغ میں جن پر ان کی بہتری کے لیے حکومت کی جاتی ہے، ایسے سوال کیوں پیدا ہوتے ہیں جن سے ان کی سوومندی غلامی میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

فرانسیسی مفکر جے جے روسو کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ انسان جب آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے کیوں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔۔۔ لیکن اس سوال کا حشر کیا ہوا؟ زنجیریں کاٹتے کاٹتے کئی انسان کٹ گئے۔۔۔۔۔ سوال پیدا ہوتا

ہے کہ آیا ایسا انقلاب جائز ہے؟ روس میں کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ صدیوں کے غلام آزادی کا سوال لے کر اٹھے اور نتیجہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ ان کے مطلق العنان بادشاہ زار کو ایک عرصے تک سائبیریا کی تین بستہ فضاؤں میں مزدوروں کا سا کام کرنا پڑا۔۔۔۔۔ آخر میں انقلابیوں نے خدا کے اس سائے کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ زار کی یہ حالت دیکھ کر شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رعایا کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے بادشاہ سامانت کو عالم پناہ کو محض ایک چھوٹا سا سوال پیدا ہونے پر قربان کر دے لیکن کیا کیا جائے۔ سوال چھوٹے ہوں یا بڑے، موٹے ہوں یا پتلے، پیدا ہو ہی جاتے ہیں، بے سوچے سمجھے، انجام کا خیال کئے بغیر، تعزیر سے بے پرواہ، بس پیدا ہو جاتے ہیں۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ جو سوال دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ان کی کاٹ دماغ ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ سوال جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کاٹ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کے پیٹ میں بھوک کا سوال پیدا ہوتا ہے، اگر اس کے جواب میں آپ ہمدردی کا اظہار کریں، آنے والے مسرت بھرے دور کا وعدہ کریں جنت کی جھلک دکھائیں، جہاں انگور کے دانے اپنے آپ جھک کر منہ میں اپنا رس چوایا کریں گے تو ظاہر ہے آپ کی سچی بار آور ثابت نہیں ہوگی کیوں کہ پیٹ کا سوال فوری جواب مانگتا ہے۔ اسے روٹی کی ضرورت ہے۔۔۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے پھر کیوں پیٹ کے سوال کا حل روٹی کی بجائے سوٹی سے کیا جاتا





اندر جھانک کر دیکھا تو ان کے دماغ میں یہ گستاخ سوال پیدا ہوا ”ہمیں تو کہتے ہیں نشتے پاؤں نہ پھرو اور۔۔۔۔۔“

بعض اوقات ایک ہی سوال، ایک ہی وقت میں ہزار لگوں کے دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل لاکھوں کی زبان پر یہ سوال ہے کہ یہ وزارت جو مغربی پنجاب پر حکومت کرتی ہے۔ وزارت ہے یا شرارت؟۔۔۔۔۔ جو عرف عام میں جاہل ہیں۔ ان کے دماغ میں بھی یہی سوال اس شکل میں پیدا ہوتا ہے ”گریبوں کی کھمبر لینے والے کہاں ہیں۔۔۔۔۔“ اب ان جاہلوں سے کون کہے کہ وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی آپ اپنی خبر میں آتی۔

اور سننے اسی قسم کے ایک جاہل آدمی کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا ”نواب دولتانہ۔۔۔۔۔ نواب مڈوٹ۔۔۔۔۔ یہ کیا نوابی ٹھاٹ ہے؟“

ایک بچہ چند روز گزرے اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا ”باجی مڈوٹ اور اخروٹ میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

سوال پیدا ہوتا ہے کیا ایسے بد تمیز بچوں کا گلا گھونٹ دینا چاہیے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایسا کرنے پر کوئی اور سوال پیدا ہو جائے گا۔

پاکستان میں آج کل مندرجہ ذیل سوالوں کی پیدائش عام ہے

- 1 عورت کو پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟
- 2 اگر پردہ ضروری ہے تو کیا نرسوں کو برقعہ پہن کر اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں؟

3 عورت کی دو چوٹیاں کرنی چاہئیں یا صرف ایک؟



## کچھ ناموں کے بارے میں

بچہ پیدا ہونے سے پہلے یہ استنساہ کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کس پر گیا ہے۔ تمہیال پر یا دوھیال پر اس کے خدو خال چھیرے ہیں، میسرے ہیں یا خلیرے۔ کوئی ناک بالکل باپ کی بتائے گا اور کوئی ہو بہو ماں کی اور کوئی اسے خالہ کے بھائی کے باپ کے چچا کے دادا کی ناک سے جانائے گا۔

بعض اوقات ایسا منفرد بچہ بھی پیدا ہوتا ہے جس کے ناک نقشے کا سراغ اس کے آباؤ اجداد کے شجرہ سراپا میں ڈھونڈنے پر بھی کہیں نہیں ملتا۔ لیکن بوڑھی عورتیں بھی کچھ ایسی کولمبس ہوتی ہیں کہ وہ یہ امریکہ بھی دریافت کر لیتی ہیں اور اس منفرد بچے کے ماں باپ کی الجھن دور کر دیتی ہیں۔

بچہ تو خیر مگر وقت کے بعد پیدا ہونا ہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ناک نقشہ ماننے کے علاوہ اس کی پیدائش پر اور بھی کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان تمام پیچیدہ مسائل کا ذکر نہیں کریں گے اس لیے کہ بچے کا نام رکھنے کا ایسا مسئلہ ہی اس صحبت کے لیے کافی ہے۔

بچہ یا بچی جو بھی آپ کی قسمت میں تھی، پیدا ہو گئی۔ اس کا ناک نقشہ بھی کھینچ گھیٹ کر کسی سے مل گیا لیکن ابھی چھٹی نہیں ہوئی اس لیے کہ اس دنیا میں نئے نئے والے یا نئی نئی آنے والی کا نام کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔ اگر آپ ڈاکٹریٹر قسم کے انسان ہیں اور اپنے عزیز واقارب کے جذبات و احساسات کو بالکل خاطر میں لانے والے نہیں تو آپ اپنے تخلیق کردہ گوشت پوست کے اوتھڑے کا



دارے کے لیے منتخب کر لیں آدمی کس کی سنے اور کس کی نہ سنے۔ کس کا کہا مانے، کس کا نہ مانے کس کا دل رکھے اور کس کا واپس کر دے۔۔۔۔۔ ناموں کی فہرستوں پر غور کرتا رہے اور بچوں کے عزیزوں کے جذبات و احساسات کو بھی پیش نظر رکھے تو بہت ممکن ہے بچہ بوڑھا ہو کر اپنے والدین کے نام پر نظر ثانی شروع کر دے۔۔۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر والدین گھبرا کر جلدی میں اپنے لخت جگر کا نام مقرر کر دیتے ہیں۔

اولاد کا نام مقرر کرنے میں بعض اوقات اس گھبراہٹ، غلت اور الجھن کے علاوہ تو ہم پرستی کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اگر لڑکا یا لڑکا بہت دیر کے بعد اور بڑی فاقے ماننے کے بعد پیدا ہوا ہے تو اس کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا جائے گا لڑکا ہے تو مثال کے طور پر اللہ دتہ، پیراں دتہ، خدا بخش، نبی بخش، لڑکی ہے تو اللہ رکھی، پیراں دتی، خیراتن، حیاتن وغیرہ اور اگر بہت سے بچے مرنے کے بعد خدا نے لڑکا یا لڑکی دی ہے تو نام کچھ یوں ہوگا۔ اللہ جوایا، رلدو، گھسیٹا، کلن، کلو، کلب علی وغیرہ۔

انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کتے کو کوئی برنامہ دو اور اسے پھانسی پر لٹکا دو۔ لیکن چونکہ بچے کو پھانسی دینا مطلوب نہیں ہوتا۔ لہذا اس کے واسطے اچھے سے اچھا نام چننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں والدین کافی دوڑ دوپ کرتے ہیں۔ قرآن سے فالس نکالی جاتی ہیں۔ زانچے تیار کرائے جاتے ہیں، نجومیوں اور جناروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ پیروں اور فقیروں کی رائے طلب کی جاتی ہے پھر جا کر بچے یا بچی کے لیے مناسب و موزوں نام ملتا ہے لیکن اولاد جو نہیں سن شعور کو پہنچتی ہے اپنے نام کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ والدین کے

جذبات و احساسات بالائے طاق رکھ دینے جاتے ہیں اور اپنے نام سے بددلی اور بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ سن شعور کو پہنچنے تک اولاد بااقل بنام رہے۔ جوں ہی لڑکا یا لڑکی شعریا افسانہ لکھنے کے قابل ہو جائے اس سے کہہ دیا جائے لو بھئی، اب تم جو چاہو اپنا نام رکھ لو۔ ایسا کرنے سے نہ تو والدین کا دل دکھے گا اور نہ اولاد ہی کو شکایت کا موقع ملے گا۔

مشہور ترقی پسند شاعر نذر محمد کا نام اگر ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہوتا تو ظاہر ہے کہ انہیں اس میں قطع و برید کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ اگر وہ نذر محمد ہی پر طوعاً و کرہاً قانع رہتے تو آج اردو ادب یقیناً نام راشد کی ترقی پسند شاعری سے محروم رہتا۔ شروع شروع میں یعنی قطع و برید کے فوراً بعد کچھ عرصے تک انہیں اپنے نام سے کچھ اجنبیت اور غیریت ضرور محسوس ہوتی ہوگی مگ اب وہ کچھ اس کے ایسے نادبی ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی انہیں نذر محمد کے نام سے پکارے تو وہ سمجھیں گے کسی اور آدمی کو بلایا جا رہا ہے۔

ایک اور شاعر ہیں ماں باپ کا رکھا ہوا نام فضل دین ہے مگر اس زمانے میں جب کہ دین اور اس کے فضل کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ نام کتنا بوسیدہ معلوم ہوتا ہے فضل دین کو اس کا شدید احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس پرانے نام کو انجم رومانی ایسے رومانیک نام میں تبدیل کر دیا۔ سینے کا یہ بوجھ ہا کا ہوتے ہی آپ نے شاعری شروع کر دی جو بڑی بلکی چٹکی ہے، اگر وہ اپنا نام فضل دین ہی رہنے دیتے تو ناقدین ادب یقیناً ان کے کلام کو پرانی شاعری کے نٹکے میں پھینک

دیتے۔

وقار انبالوی صاحب نے پہلے اپنا نام غاٹف مولاناوی رکھا چنانچہ اس نام سے ”ہمایوں“ میں ان کے اکثر مضامین چھپتے رہے لیکن جب انہوں نے غاٹف مولاناوی کے سامنے اپنا اصلی نام کاظم علی رکھ کر دیکھا تو یہ تبدیلی انہیں باوقار معلوم نہیں ہوئی چنانچہ انہوں نے دوسرا چولابہ لایا اور وقار انبالوی ہو گئے۔

ابوالکلام آزاد پہلے معین احمد تھے۔ ساغر نظامی، صدیا رخاں۔ ان کے استاد سیما ب، عاشق حسین۔ حضرت جوش، شبیر حسن خان، گلبرادر آبادی، علی سکندر، سید جالب، بشارت علی اور نوح ناروی بندے حسن۔

قتیل شامانی کے ساتھ ان کے والدین نے یقیناً ظلم کیا تھا جو اورنگ زیب نام رکھ دیا۔ کہاں ترقی پسند شاعری اور کہاں رذعت پسند اورنگ زیب۔ میراجی کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ بھی شاعر ہیں اور ایسے ترقی پسند شاعر ہیں کہ ان کا بیشتر کلام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر رہتا ہے۔ آپ کا اصلی نام ثناء اللہ تھا۔ جس کا مطلب واضح ہے اگر آپ ثناء اللہ ہی رہتے تو آپ کو مجبوراً ایسے اشعار کہنے پڑتے جن کا مطلب واضح ہوتا لیکن ثناء اللہ کی زندگی کا مقصد چونکہ یہ نہیں تھا اور وہ پر اسرار قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے اس لیے انہیں اپنا نام بھی کچھ اسی قسم کا رکھنا پڑا۔

مرزا ادیب بی اے آنرز شاعر تو نہیں لیکن شاعرانہ طبیعت رکھنے والے افسانہ نویس ضرور ہیں۔ آپ کا اصلی نام دلاور علی ہے۔ نہ تو آپ دلاور ہیں اور نہ دل بدست آور چنانچہ جو نہیں آپ کو اپنے نام اور اپنے کردار میں بعد محسوس ہوا۔ آپ ارتقاء کی تمام منزلیں ایک ہی جست میں طے کر کے مرزا ادیب بی اے آنرز بن



گئے۔

اردو ڈرامہ نگاری کے دو نقاد بہت مشہور ہیں جن کا نام ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ چپکا رہتا ہے۔ ہماری مراد محمد عمر نور الہی صاحبان سے ہے۔ شوکت تھانوی صاحب کا اصلی نام محمد عمر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تھانے میں جب شوکت صاحب نے ظرافت نگاری شروع کی ہوگی تو اس لیے کہ انہیں بھی اپنے لیے ایک نور الہی پیدا کرنا پڑے گا خوف الہی کھا کر اپنا نام تبدیل کر لیا واللہ اعلم بالصواب۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر میں کافی رعب ہے لیکن اصلیت کی طرف جائیں تو صرف محمدوین رہ جاتا ہے جس کے ساتھ ڈو کٹریٹ انمک بے جوڑی لگتی ہے۔ احمد شاہ بخاری، اے بخاری ہی کی شکل میں بھٹے گتے ہیں۔

ان کی مزاح نویسی پر احمد شاہ باکل چسپاں نہ ہوا کیونکہ لوگوں کا خیال احمد شاہ ابدانی کی طرف چلا جاتا جسے مزاح اور ظرافت کی بجائے لوٹ مار سے دلچسپی تھی۔ بہزاد لکھنوی کی اصلیت نور محمد ہے۔ یوں تو ان کی بھوی داڑھی اور چوڑی پیشانی سے کافی نور برستا ہے لیکن ریلوے کی ملازمت کے دوران میں جب آپ کو محسوس ہوا کہ ان کی جبات کو نور سے زیادہ رنگوں سے نسبت ہے تو آپ نور اکایا کلپ کرا کے بہزاد لکھنوی بن گئے اور بڑے سکون اور اطمینان سے شاعری شروع کر دی خضر تمیمی صاحب اگر مولا بخش ہی رہتے تو ظاہر ہے دنیائے ادب میں ان کی وہی حیثیت ہوتی جو سکولوں میں استاد کے ڈنڈے کی ہوتی ہے۔

فلموں کے مشہور گیت لکھنے والے ڈی این مدھوک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بے نیاز انسان ہیں لیکن ان کو بھی اپنا اصلی نام جو کہ دینا نا تھ

ہے، پسند نہ آیا اور اسے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی طرح فرنگی رنگ میں رنگ دیا۔  
فلموں کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ناموں کی شدھی کا بھی ذکر خیر و شر ہو جائے  
پورن بھگت بن رہا تھا۔ دیو کی بوس نے پورن کے رول کے لیے لکھنؤ کے ایک مسلم  
نوجوان علی میر عرف جسن کو منتخب کیا لیکن سوال پیدا ہوا کہ ہندو قوم معترض ہوگی۔  
اتنے بڑے بھگت کاروپ ایک مسلمان نے دھارن کیا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے  
پیش نظر علی میر کے نام کی شدھی کر دی گئی اور وہ اس فلم میں مار کے نام سے پیش  
ہوا۔

اس کے بعد مسلمان ایٹروں اور ایٹرسوں کو ہندوانہ نام دے کر پیش کرنے  
کا ایک فیشن بن گیا۔ ذکریا خان جو ٹھیٹ پٹھان ہے جینت ہو گیا اور یوسف،  
دلپ۔ مار کشمیری نذر کی شدھی ہوئی اور وہ ”امر“ ہو گیا۔

اب ایٹرسوں کو ایٹے تا جور (تاجور نجیب آبادی صاحبسے اس تاجور کا کوئی  
تعلق نہیں) وینا بن کر فلموں میں گونجنے لگی اور شاہدہ کو جب فلموں میں مشہور کیا گیا  
تو اس کا نام نینا تھا۔

دو غلام بھی رکھے گئے جن سے ہندو مسلم اتحاد کی بو آئے۔ مثال کے طور پر  
ممتاز شانتی، گینا نظامی وغیرہ وغیرہ، ایک ایٹریس کا نام ہے آشنا پوسلے، سمجھا  
کرے کوئی، ناموں کے معاملے میں سیکھ حضرات دوسروں کے مقابلے میں بہت  
ثابت قدم واقع ہوئے ہیں۔ سردار کھڑک سنگھ اتنے برس گزر گئے ہیں انہیں  
کھڑکتے ہوئے لیکن مرحبا ہے کہ ابھی تک ان کے دل میں کھڑکھڑاتا نام تبدیل  
ہونے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔

تقسیم ہندوستان سے پہلے لاہور میں ایک ودھاوا سنگھ تھے آپ کو اس بیڈھب نام سے بالکل نفرت پیدا نہ ہوئی اور جب تک یہاں دکان رہی، برابر ”بھائی ودھاوا سنگھ کے اچار شائع“ کا اشتہار دیتے رہے۔

سکھوں میں کئی لاہور سنگھ ہیں، پشاور سنگھ ہیں، پیماوڑا سنگھ ہیں، ہتھوڑا سنگھ ہیں، ہمارا خیال ہے ان میں سے اگر کوئی ترقی پسند شاعر ہی کیوں نہ بن جائے تو بھی وہ اپنا نام تبدیل نہیں کرے گا۔

مر جائے تے بھاریں جائے میری سبھی صدق نہ جائے  
سکھوں کی جرأت رندانہ کی داد دینی پڑتی ہے ورنہ ایمان کی بات ہے کون  
پیماوڑا سنگھ جیسے بھاری بھر کم نام کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔

بلکہ پھلکے اور خوبصورت نام رکھنے میں گانے اور مجرا کرنے والیاں پیش پیش ہیں، شمشاد ہے، صنوبر ہے، گلاب ہے، نیلم ہے، الماس ہے، انوری ہے، مشتری ہے، زہرہ ہے اور یہ نام کچھ اس طرح اس خاص صبقے سے منسوب کئے ہوئے ہیں کہ دوسروں کے لیے شجر ممنوعہ بن گئے ہیں۔

گانے والیوں میں بو ابانی، چھوٹی موٹی بانی اور طمنچہ جان ایسے عجیب و غریب نام بھی موجود ہیں آخر الذکر کو ترقی پسندی کی آخری حد تک جا پہنچا ہے مگر صلائے عام ہے یاران نکتہ واں کے لیے۔۔۔۔۔ آج کل دوسری اجناس کی طرح ناموں کا بھی قحط ہے۔ نئے نام تلاش بسیار کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے طمنچہ جان نے نئے ناموں کا ایک بالکل ہی نیارستہ کھول دیا ہے۔ بڑی آسانی سے ایسے مسلح نام وضع کئے جاسکتے ہیں۔

توپ ماری، اٹنٹن ایر کرافٹ نیگم، ایٹم الدین، ٹینک سنگھ، بندوق بانو، گولہ  
بخش، مشین گن داس، بل ڈوزر خان، سنگین خاتون، مائن کور، قہری نوٹ قہری چند،  
ہینڈ گریپس ڈیوی، مورٹل، بوہر بانی، دی ون جان، دی ٹوبوس وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

## میں فلم کیوں نہیں دیکھتا

بہت دنوں سے میری خوانش تھی۔ کوئی مجھ سے سوال کرے کہ میں فلم کیوں نہیں دیکھتا۔ گھر میں کئی دفعہ مجھ سے پوچھا گیا کہ ”میں بھنڈی کیوں نہیں کھاتا“ یار دوستوں نے متعدد بار دریافت کیا ”میں پتلون کیوں نہیں پہنتا“ گھر اور گھر کے باہر یہ استفسار بھی کئی مرتبہ ہوا کہ ”میں بال کیوں نہیں کھاتا“ پر مجھ سے میری خوانش کے مطابق یہ کسی نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ”میں فلم کیوں نہیں دیکھتا؟“۔۔۔ حالانکہ مجھے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلم ایک زمانہ ہوا، مجھے بے حد مرغوب تھے۔ ایک ایک دن میں تین تین فلم دیکھتا اور جو پسند آ جائے اسے بار بار دیکھتا تھا۔ امرتسر سے لاہور اور جالندھر جا جا کے دیکھتا تھا اور مجھے یاد ہے ایک فلم کے لیے جس میں میری پسندیدہ ہیروئن کام کر رہی تھی۔ مجھے دہلی تک کا سفر اختیار کرنا پڑا لیکن ایسا کیا ہوا جو میں نے فلم دیکھنے بند کر دیئے۔

بہت دنوں کے بعد یہ مجھے آج موقع ملا کہ اپنے دل کا بوجھ ہا کا کر دوں ورنہ جب بھی فلم دیکھنے کی دعوت پر میں نے کسی دوست سے کہا ”میں فلم نہیں دیکھا کرتا“ اور متوقع رہا کہ وہ مجھ سے پوچھے گا، آخر کیوں؟ مجھے ہمیشہ ناامیدی ہونی کسی نے کھٹ سے موٹر کا دروازہ بند کیا اور اچھا کہہ کر یہ جاوہ جا۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور میں نے بجائے ”آخر کیوں؟“ کے یہ سنا ”تم عجیب و غریب آدمی ہو“ اور کسی نے بالکل نیوں کی طرح کہا ”اچھا ہے، میرے پیسے بچ گئے۔“

کوئی زمانہ تھا کہ ایڈی پو پو سے لے جون گلبرٹ اور میری پکفورڈ سے لے کر گلوریاسونسن تک مجھے تمام ایٹرا یاٹرسوں کے نام، ان کے پتے اور ان کی عمریں یاد تھی۔ لڈین گش اور اس کی بہن ڈور تھی کش کے قد کی لمبائی تو مجھے ابھیت ک یاد ہے لیکن آج مجھ سے کوئی پال روسن کی بات کرے تو میرا دھیان روسن کر سو کی طرف چلا جاتا ہے اور زنجیر کا ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے دوست احباب شاننا وین، شاننا ہلی کر اور شاننا موزدار کی کردار نگاری پر بحث شروع کرتے ہیں تو میں چلا دیتا ہوں ”شانقی! شانقی“ پری چہرہ نسیم بانو، حور ثمال وینا، آہو چشم راغنی، کافر اٹریا اور مرمریں جسم شمیم سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں آپ سوچیں گے شاید میں دنیا تیاگ کے سنیا سی بن گیا ہوں، بدن پر بھجھوت مل کے میں نے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آسن جمایا ہے۔۔۔۔۔ جی نہیں، میں ابھی تک آپ ہی کی دنیائے رنگ و بو میں سانس لے رہا ہوں کل کا بھروسہ نہیں۔ ابھی تک کہتا ہوں، پیتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں، اچھے افسانے پڑھ کر داد دیتا ہوں، موزوں شعر سن کر پھرخ بھی جاتا ہوں لیکن صاحب میں فلم نہیں دیکھتا۔

کوئی زمانہ تھا، میرے کمرے کی زینت صرف ایٹرا اور ایٹرسوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان تصویروں کے فریم میں خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتا تھا لیکن آج میرے کمرے میں آپ کو صرف ڈاسن کے کارٹون آویزاں نظر آئیں گے جو بندوں کے نفسیات کی تصویر کشی کا ماہر ہے۔۔۔۔۔ آپ سوچئے اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا ہوا؟

میرے دل و دماغ میں بہت ہی خوبصورت صنم خانہ تھا جس میں ہر شام اپنے



کیا۔ مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو یہی وجہ ہے کہ میں آج بااکل فلم نہیں دیکھتا۔  
آج سے بارہ برس پہلے کی بات ہے میں نے بمبئی کے فلمی سومنات پر چار حملے  
کئے۔ آخری حملہ زندگی کی تاریخ میں بہت مشہور اور اہم ہے کیونکہ میں ایک  
اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔ خوف ناک پٹھان  
پہرے دار کی نظر بچا کر جوئی میں پھانک کے اندر گھسا، چاروں طرف سے ”آدم  
بو، آدم بو!“ کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک کالی عورت پاس سے گزری تو میں نے  
دل میں دعا مانگی کہ وہ مجھ پر عاشق ہو جائے اور الف لیلی کی ہیروئنوں کی طرح  
کوئی افسوں پھونک کر مجھے کبھی بنا دے تاکہ میں آنے والی آفت سے محفوظ ہو  
جاؤں مگر وہ کو لہے بٹکتی چلی گئی۔ اتنے میں ایک شور برپا ہوا اور میں نے دیکھا کہ  
بتہ سے آدمی زدہ بکتر پہنے ہاتھ میں بنگلی تلواریں لیے ایک کونے سے نمودار ہوئے  
اور ماتے پھدکتے ایک بہت بڑے اصطلیل میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔ ان میں  
سے ایک کی تلوار ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھانا چاہی تو میرا  
ہاتھ ہواہی میں تل کر رہ گیا۔۔۔۔۔ تلوار لکڑی کی طرح تھی۔

انگوٹھے پر لب لگا کر میں ابھی اس تلوار کی دھاری دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے  
ایک بڑی بڑی موچھوں والا قوی نیکل دیو نمودار ہوا۔۔۔۔۔ یہ پھانک کی  
طرف جانے ہی والا تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی ”اے کمپنی کا مال لئے کدھر جاتا  
ہے؟“

موچھوں والا دیو کانپ گیا اور لرزاں آواز میں بولا ”کیا ہے سیٹھ؟“  
سیٹھ نے جسے میں رلبہ اندر سمجھا تھا، بارعب آواز میں پوچھا۔ یہ موچھ کس کا





اور ایک پائنگ سوپ سگریٹ۔۔۔۔۔ یہ میں سب ابھی حاضری کئے دیتا ہوں،  
لیکن یہ ”فرض ادا“ کی ترکیب بالکل غلط ہے۔“  
سیٹھ صاحب نے غصے سے پوچھا ”کیا بولا؟“  
میں بولا ”میں یہ بولا کہ جو کچھ آپ بولے ہیں، ہماری بولی میں چلنے کو نہیں  
سکے گا۔“

ڈائریٹر صاحب بولے ”کیسے چلنے کو نہیں سکے گا؟“  
میں بولا ”ایسے چلنے کو نہیں سکے گا کہ یہ ایک دم روٹک ہے۔ ادا یعنی فرض ہو سکتا  
ہے فرض ادا یعنی کہہ لیجئے زیادہ سے زیادہ ادا یعنی فرض کہہ لیجئے کہ اس کا مطلب  
بھی وقت آنے پر نکال لیا جاسکتا ہے لیکن از برائے خدا ”فرض ادا“ نائیل فوراً  
پینچ کر دیتے ہیں۔“

سیٹھ صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا ”تمہارا بھیجا پھرے لا ہے منسی  
نائیل پینچ ہونے کو نہیں سکتا۔ اس واسطے کہ ہم فلم بیچ چکا ہے“ یہ سن کر میرا بھیجا یعنی  
دماغ پھر گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں کمپنی کے باہر تھا۔

دوسری کمپنی سے باہر نکلنے کی داستان بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ تازہ فلم کا نام ”الو  
کے دو پٹھے“ تجویز ہوا۔ میں نے اعتراض کیا اور ”الو کے دو پٹھے“ کیا ہوا ”دو الو  
کے پٹھے“ ہونا چاہیے جو اب ما ”تم کون ہوتے ہو مال پانی ہمارا خرچ ہو رہا ہے،  
ہم چاہے گا تو پٹھے کے دو الو بھی چلے گا“ چنانچہ ”الو کے دو پٹھے“ کی شوٹنگ شروع  
ہو گئی اور میں کمپنی کے باہر تھا۔

فلموں سے اب میرا دل ٹوٹنا اور کھٹنا ہونا شروع ہوا اور چند برسوں ہی میں چور





ہے۔

وادی کشمیر میں برف باری ہو رہی ہے لیکن بہت سے مزدور کاغذ کے بنے ہوئے سردوں پر اوپر سے صابن کی ہوائیاں اور کاغذ کے ننھے ننھے ٹکڑے منتشر کر رہے ہیں۔

بڑے حسین قسم کا کہر چھایا ہوا ہے جس میں ملفوف بیرو اور بیروئن ایک دوسرے کے ساتھ لگے محبت بھری باتیں کر رہے ہیں لیکن سیٹ پر دونوں کا سانس سوکھی گھاس کے دھوئیں میں گھٹ رہا تھا۔

ابھی ابھی بیروئن بیرو کے ساتھ سیٹ پر ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ شوٹنگ شروع ہوئی تو میک اپ مین نے ڈروپر سے اس کی آنکھوں میں گلیسرین کے چند قطرے ڈال دیئے اور الو صاحب، آنسوؤں کے موتی ڈھلکنے لگے۔

گا کوئی رہا ہے، لب کسی کے بل رہے ہیں۔ لکڑی کا ٹیلی فون میز پر دھرا ہے پاس ہی ایک آدمی گھنٹی لیے کھڑا ہے۔ وہ بجاتا ہے تو بیرو صاحب جھٹ سے ریسیور اٹھاتے ہیں جیسے سچ کال آئی ہے۔ بیروئن گیسو بریدہ ہے لیکن پردے پر دیکھو تو کسی زلف دراز تیل کا اشتہار دکھائی دیتی ہے۔ گھونسا چماتا ہے، لگتا لگا تا کسی کے بھی نہیں لیکن دو تین آدمی چپت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میز پر پھلوں کے انبار لگے ہیں لیکن ان میں صرف ایک کیلا اصلی ہے جو بیرو کے والد بزرگوار کو کھانا ہے باقی سب مٹن کے ہیں، چلچلاتی دھوپ ہے لیکن کیمرے پر ریڈ فلامر لگایا اور لیجے دھوپ ٹھنڈی چاندنی میں تبدیل ہو گئی۔ زہرا نہیں مانتا تو گدھے ہی پر سیاہ و سفید دھاریاں کھینچیں اور زہرا بنا دیا۔

میدے کی چٹکی پھانک کر آدمی مر رہا ہے اور لوگ واویلا کر رہے ہیں۔ آدمی  
اوپر سے نیچے گر رہا ہے کیمرہ اٹھا گھما دیا۔ پردے پر وہ اچک کر اوپر جاتا دکھائی  
دے گا جیسے اس کے اسپرنگ لگے تھے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھے گا۔  
یقین مانئے یہ بناوٹیں دیکھ کر میرا دل کھٹا ہو گیا اور انگریزی ضرب البٹل  
کے اونٹ کی کمر اس آخر تک نے توڑ دی۔ جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے  
بنے ہوئے فلم کو ہال میں تماشا نیوں کے ساتھ دیکھا اور بیروئن کی مصنوعی پلکوں  
سے پھلتے ہوئے گلیسرینی آنسوؤں نے مجھے ایک سے زیادہ باررایا۔  
کتنا بڑا فریب ہے یہ فلم کہ خود فریب ساز بھی فریب کما جاتے ہیں۔ خدا اب  
مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں فلم دیکھوں۔

☆☆☆☆☆

## سویرے جو آنکھ میری کھلی

جب تھی بیمار اور جب سیر تھی یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل بیٹا تا ڈر باغ  
چل۔ باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گیانیاں طے کی ہوں  
گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا ابھالا تھا پر  
جب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا، بجلی کے کھمبے پر دیکھا، پر تالے پر دیکھا، شہ نشین  
پر دیکھا، چھتے پر دیکھا، چوہارے پر دیکھا، غرضیکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا  
وہاں دیکھنے کی حسرت لیے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد یہ لکڑیوں کی نال ہے پاکستان زندہ باد، نمائندہ مہاجر ہیر کنگ  
سیلون پاکستان زندہ باد یہاں تالے مرمت کئے جاتے ہیں۔ پاکستان زندہ باد،  
گر ماگرم چائے پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال۔۔۔۔۔ پاکستان زندہ  
باد، الحمد للہ کہ یہ دکان سید انور حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا پاکستان زندہ باد۔۔۔۔۔ یہ گھر  
ایک پارسی بھائی کا ہے۔۔۔۔۔ یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجئے گا۔  
صبح کا وقت تھا۔ جب بہار تھی اور جب سیر تھی قریب قریب ساری دکانیں بند  
تھیں ایک حلوانی کی دکان کھلی تھی میں نے کہا چلو سی ہی پتے ہیں دکان کی طرف  
بڑھا تو کیا دیکھا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے میں  
نے حلوانی سے کہا ”یہ اٹے رخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔۔ اس  
نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا ”دیکھتے نہیں ہو۔۔۔۔۔ میں نے

دیکھا۔۔۔۔۔ پکھے کارخ قائد اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی۔۔۔۔۔ میں نے زور کا نعرہ لگایا ”پاکستان زندہ باد“ اور لسی پئے بغیر آگے چلا دیا۔“

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے۔ یہ پوری والا کدھر سے آ گیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو لیکن بورڈ وہی تھا سامنے وہی فسادات میں حملسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا ”کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی گرما گرم پوریاں ہیں“ میں نے کہا ”بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو، یہاں جوٹوں کی دکان ہوا کرتی تھی“ پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا ”جوٹوں کی دکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے تم ہو جاتی ہے۔“

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لیے سڑک پر سے چن رہا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ چننے کی بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں ادھرا ادھرا گر رہا ہے تو میں کچھ دو رکھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ناٹ پر بیٹھ گیا۔



پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بوڑھا لگا تھا ’یہاں سائیکوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے‘  
میں نے قدم تیز کر دیئے۔

دکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آنی پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دلیس ویسا بھیس

تحریر خوش خط تھی اور نام بھی جاذب نظر تھے۔ مثال کے طور پر ’’آرائش‘‘ ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلقہ سامان ہوگا ایک ہوٹل کھلا تھا اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں ’’ما حاضر‘‘ لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام ’’پاپو شیانہ‘‘ تھا یعنی جوٹوں کا آشیانہ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بوڑھا آویزاں تھا ’’زمہری‘‘ ضرور قلنیوں کی دکان تھی

میں نے خوش ہو کر ’’پاکستان زندہ باد‘‘ کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی پوچھا ’’یہ کیا ہے؟‘‘ جواب ملا ’’ہوٹل‘‘۔۔۔۔۔ چلتے پھرتا ہوٹل تھا۔ چپا تیاں پکانے کے لیے انگیٹھی اور تو ا موجود۔ چار سائن تیار شامی کباب تانے کے لیے فرانی پین حاضر، پانی کے دو گٹرے، برف لیونیڈ کی بوتلیں، دہی کا کوٹڑا۔ لیموں نچوڑنے کا کھٹکا۔ گلاس پلٹیں غرضیکہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھتا دیکھا، ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے بچہ پوچھی تو معلوم ہوا لڑک انوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا

نوٹ گما دیا ہے میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا ”کیا ہوا بچہ ہے، کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ہی ہوتا ہے، ایک روپے کا نوٹ۔ کہیں گریڑا ہو گا خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔“

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے الجھ گیا اور کہنے لگا ”تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے، آج کل“۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔ چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا ”روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟“

میں نے جواب دیا ”جی ہاں! بہت بری طرح پیٹ رہا تھا بے چارے کو“

”بے چارہ اس کا اپنا لڑکا ہے“

”کیا کہا؟“

”باپ اور بیٹے دونوں کا یہی کاروبار ہے دو چار روپے روزانہ اسی ڈھونگ

سے پیدا کر لیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے، اور قدم آگے بڑھا دینے۔“

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بندل

لئے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں

سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے ہیں، تازہ تازہ اور گرما گرم

خبریں۔۔۔۔۔ دہلی میں جو تاج چل گیا۔۔۔۔۔ لکھنؤ میں ناناں لیڈر کی کونٹھی پر

کتوں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیش گوئی کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ آج کا تازہ ”نوائے صبح“۔۔۔۔۔ آج کا تازہ ”ابو الوقت“۔۔۔ آج کا تازہ ”سنہرا پاکستان“

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گزر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ سنجیدہ اور متین صورت ایک ہاتھ میں تھیما تھا دوسرے میں اخباروں کا بندل میں نے پوچھا ”کیا آپ اخبار بیچتی ہیں“ مختصر جواب ملا ”جی ہاں“ میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لیے آگے بڑھ گیا۔

تموڑی، جی دیر میں کتوں کا ایک غول نمودار ہوا بھونک رہے تھے ایک دوسرے کو بچھوڑ رہے تھے۔ پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کے ایک طرف ہٹ گیا کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دن، دس دس کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں بھگوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کوئی بھی ہوں، ان کا خیال تو رکھنا چاہیے جو پناہ گیر ہیں۔ ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں۔ ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام لایا کر دیا جائے۔ جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں اور جن کا کوئی واپس وراثت نہیں ان کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے ہیں۔

کتوں کاغول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی میں نے قدم بڑھانے شروع کیے میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا سرورق پر ایک فلم ایٹریس کی تصویر تھی، تین رنگوں میں، ایٹریس کا جسم نیم عریاں تھا، نیچے یہ عبارت تھی۔

”فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے اس کا کچھ اندازہ اس تصویر سے ہوسکتا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا دوسرا اخبار کھولا ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی مضمون یہ تھا ”میں نے کل اپنی سائیکل لائینڈ زبینک کے باہر رکھی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی لیکن نئی غائب ہے۔ میں غریب مہاجر ہوں جس صاحب نے لی ہو، براہ کرم مجھے واپس کر دیں۔“

میں خوب ہنسا اور اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گزوں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دکان دکھائی دی اس کے اندر ایک برف کی دو موٹی موٹی ملیں رکھے بیٹھا تھا میں نے دل میں کہا ”اس دکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی۔“

دو تین سائیکلیں دیکھیں جموڑے جموڑے وقفہ کے بعد مرد چلا رہے تھے اور ایک برقع پوش عورت پیچھے کیرئیر پر بیٹھی تھی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی لیکن برقع پوش عورت آگے بیٹل پر بیٹھی تھی۔ دفعۃً خربوزے کے چھلکے پر سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبائے پھسلنے اور بریک لگانے کے

دوہرے عمل سے سائیکل الٹ کر گری میں دوڑا مدد کے لیے مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بے چاری سائیکل کے نیچے دبئی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اٹھایا مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا ”آپ تشریف لے جائیں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں“ یہ کہہ کر وہ اٹھا عورت کے سر پر اوندھا سیدھا برقع اٹکایا اور اس کو بینڈل پر بٹھا، یہ جاوہ جا۔۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آگے سڑک پر خربوزے کا کوئی اور چھلکا نہ پڑا ہو۔

تموٹری جی دور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی معنی خیز تھا ”مسلمان عورت اور پردہ۔“

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا، پوچھا ”کیوں صاحب یہاں ایک بت ہوتا تھا، وہ کہاں گیا؟“

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا ”چلا گیا“

”چلا گیا آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟“

وہ مسکرایا ”نہیں اسے لے گئے“

میں نے پوچھا ”کون“

جواب ملا ”جن کا تھا“

میں نے دل میں کہا ”لو اب بت بھی ہجرت کرنے لگے۔۔۔۔۔ ایک دن وہ بھی اُٹے گا جب لوگ اپنے اپنے مرد بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں

گے۔“

یہی سوچتا ہوا قدم اٹھنے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح ٹہل رہے تھے مجھ سے کہا ”بت کہیں گیا نہیں یہیں ہے اور محفوظ ہے۔“

میں نے پوچھا ”کہاں؟“

انہوں نے جواب دیا ”غائب گھر میں“

میں نے دل میں دنا مانگی ”اے خدا! وہ دن نہ لائیو کہ ہم سب غائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو جائیں۔“

فٹ پاتھ پر ایک دہلوی مہاجر اپنے صاحبزادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے۔ صاحبزادے نے ان سے کہا ”اباجان! ہم آج چھولے کھائیں گے۔“

اباجان کے کان سرخ ہو گئے ”کیا کہا؟“

برخوردار نے جواب دیا ”ہم آج چھولے کھائیں گے“

اباجان کے کان اور سرخ ہو گئے ”چھولے کیا ہوا، چنے کہو“

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا ”نہیں اباجان! چنے دلی میں ہوتے

ہیں۔ یہاں سب چھولے ہی کھاتے ہیں“ اباجان کے کان اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا الارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ تھا پرانا لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی۔ صنف نازک تو قریب قریب مفقود تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے، کلیاں چٹک رہی تھیں۔ بلکی چھلکی فضا، میں خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ میں نے سوچا، عورتوں کو کیا ہوا ہے جو گھر میں قید ہیں۔ ایسا خوبصورت باغ، اتنا سہانا موسم، اس سے لطف



حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است  
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

☆☆☆☆☆



## یومِ اقبال پر

معزز حاضرین اور میرے ہم قلم رفیقو!

یومِ اقبال کی اس پہلی نشست کی صدارت کا اعزاز جو آپ نے مجھے بخشا ہے  
رسمًا مجھے اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے لیکن بندہ سرگشتہ رسوم و قیود نہیں۔

صدارت کی کرسی کی طرف دیکھ کر البتہ ایک الجھن سی ضرور ہوتی ہے۔ اتنی دیر  
گالیاں اور سٹھنیاں کھاتا رہا اور آج۔۔۔۔۔۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم کے  
ساتھ کیا ہوا تھا۔ اپنے زمانے میں اعمیٰ طعن کے علاوہ ان کو تو الحاد اور کفر کے فتوؤں  
سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ ایسا سوچنے پر یہ الجھن تو کسی حد تک دور ہو جاتی ہے  
لیکن ایک دوسری الجھن جو اس وقت مجھے محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ شاعری سے  
مجھے اتنا شغف ہے جتنا مہاتما گاندھی کو فلموں سے تھا۔ بہر حال مجھے اس موقع  
سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو آپ حضرات نے مجھے دیا ہے۔

اقبال کے کلام سے میرا سب سے پہلا تعارف ہوٹل کے بل سے ہوا۔ آج  
سے تقریباً پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ زندگی سے قطعاً مایوس ہو کر میں فرار کے  
طور پر کھیل کھیل رہا تھا۔ ایک رات، نم غلط کرنے کے سامان کے دام چکانے لگا تو  
بل کی پرچی کی پشت پر فارسی کا یہ مصرعہ نظر آیا۔

اگر خواہی حیات، اندر خطر زری

کسی ہم مشرب کی بروقت نصیحت تھی یا پیرمغان کی شہنشاہت آج یہ عالم ہے کہ  
زندگی چاہے مجھ سے مایوس ہو جائے میں اس سے مایوس ہونے کا کبھی نام نہیں

ایتنا۔ مہنگے سے مہنگے داموں پر خطرے مول لیتا ہوں اور اونے پونے داموں بیچ دیتا ہوں لیکن خدا گواہ ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔

اقبال کے کلام سے مزید تعارف بھی اسی زمانے سے ہوا۔ ایک کتب فروش نے مجھے ڈرتے ڈرتے ”بال جبریل“ دکھائی اور سب سے پہلے وہ نظم پڑھنے کیلئے کہا جس کا عنوان شاید فرمان خدا ہے۔ ہم دونوں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بیک زبان ہو کر پڑھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو  
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

ان دنوں اقبال کو بالاشوئیک یعنی روس کا ایجنٹ سمجھا جاتا تھا۔ آج جب کہ یہاں آزاد اسلامی حکومت قائم ہے۔ خدا کا یہی فرمان دہرانے کے لیے کمیونسٹ کہلاتے ہیں اور ان کے سر پر قانون کا غناب منڈلاتا رہتا ہے لیکن خدا کا اتنا شکر ہے کہ اقبال کا کلام اس قسم کے احتساب سے آج کل محفوظ ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر سننے میں آئی کہ مغربی پنجاب کے ایک گاؤں میں مہاجر کسانوں نے اناج کے ایک بہت بڑے ذخیرے کو آگ لگا دی اس لیے کہ جاگیرداروں نے رات ہی رات اسے چرا کر اپنے گوداموں میں بھریا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ضروری نہیں کہ مخلص آرٹسٹ کا پیغام کتابوں، تصویروں اور آوازوں ہی سے لوگوں تک پہنچے۔ جب کوئی آرٹسٹ ساز زندگی کے کسی تار کو چھیڑتا ہے تو اس کی لرزش کی گونج صدیوں تک فضاؤں میں تیرتی رہتی ہے اور کھینچ کر خود بخود دل کے ان تاروں تک پہنچ جاتی ہے جو اذیت دینے والے ہاتھوں نے جھنجھوڑے



کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نور بصیرت بہت دیر تک جہالت کی  
تنگ اور اندھیری گلیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے بیرے کا جگر  
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

☆☆☆☆☆

## محبوس عورتیں

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد اس قدر مجاسی و معاشرتی مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یوں تو ہر شخص انہیں سلجھانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شور زیادہ ہے اور کام بہت ہی کم ہو رہا ہے۔ برطانوی سامراج کی حکمت عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے دمانوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابک دست جراح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا۔ ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بھرے کئے اور یہ جاوہر جا۔ اور وہ جن کے تدبیر، وہ جن کی دقیقہ رسی، وہ جن کی شامیں نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی۔ آج ہمیں جھپکتے رہ گئے۔

پچھلے چند مہینوں میں اس سرزمین پر جس کا نام کبھی ہندوستان تھا۔ خون کے وہ دریا سب سے کہ جس پر چشم فلک بھی حیران ہے۔ فنا کو بادہ ہر جام بنایا گیا۔ دوسری اجناس نایاب مگر انسانی گوشت پوست کی دکانیں عام کھلی تھیں۔ ہر بازار میں ایک عام ٹکانگی نصب تھی۔ ہر چوک میں ایک قفل تھا۔ چنگیز اور ہلاکو، امیت تیور گورگانی، نادر شاہ درانی اور بیہمت و بربریت کا تازہ ترین سلب سردار اوڈلف ہٹلر بھی اگر ان خونیں مناظر کو دیکھتا تو یقیناً خود کو ناچیز سمجھتا لہو اور لوہا، جنگ اور فنگ انسان کی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ اولاد آدم ان کھیلوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتی رہی ہے مگر وہ کھیل جو پچھلے دنوں کھیا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثال ابن آدم کے رنگین فسانے میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

خود کو حیوانوں سے کچھ اونچا رکھنے کے لیے انسان نے قتل و غارت گری کے لیے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں لیکن جس قتل و غارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ ان آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہنے کہ حیوانیت سے بھی یکسر مبرا تھی۔ جس کی تصویر شاید یہ قتل و غارت گری خود بھی نہ کھینچ سکے۔

اس وقت ہماری نظروں کے سامنے خون کی سوکھی ہوئی پڑیاں کئے ہوئے اعضا جملے ہوئے چہرے، روندھے ہوئے گٹے، ٹھٹھری ہوئی جانیں، لٹے ہوئے مکان، جلے ہوئے کسیت، ملبے کے ڈھیر اور بھرے ہوئے ہسپتال ہیں۔ ہم آزاد ہیں، ہندوستان آزاد ہے، پاکستان آزاد ہے اور ہم گرسلی و بربنگی، بے سرو سامانی اور بے حالی کی ویران سڑکوں پر چل پھر رہے ہیں۔

گندم نہیں ہے، روٹی نہیں ہے، چاول نہیں ہے، گرائی ہے، قحط ہے، بیماریوں کی یاغار ہے، سردیوں میں آگ نہیں، گرمیوں میں پانی نہیں، زمینیں سکڑ گئی ہیں، آسمان سکڑ گئے ہیں، تدبیر کے گھسے ہوئے ناخن یہ پیچیدہ گرہیں کھولنے میں مصروف ہیں اور ہم محو قماش ہیں۔

ٹھنڈی زمینوں پر لٹی ہوئی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے آخری قطرے منجمد ہو رہے ہیں۔ قدرت کا بے رحم ہاتھ بچوں کو ان کے آخری اثاثے سے محروم کر رہا ہے لیکن ایسی حویلیاں بھی ہیں جہاں ننھے کا بچا ہوا دودھ موریوں میں بہایا جاتا ہے۔ لاکھوں ستم رسیدہ تن ڈھانپنے کے لیے ایک چیتھڑے کو ترس رہے ہیں لیکن وہ بھی جو فیشن کی ٹوک پلک درست رکھنے کے لیے طرح طرح کے ملبوسات سے اپنی الماریاں سجائے بیٹھے ہیں۔

یہ تماشا کب تک جاری رہے گا۔ کب تک مظلوم انسانیت کپڑے کے پھٹے ہوئے خیموں میں قید رہے گی، کب تک مجبور نسوانیت تحفظ کی نام نہاد چار دیواری میں شہوانیت کی شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک غربت و بے چارگی سرمائے کے ہاتھوں فروخت ہوتی رہے گی۔ کب تک؟

ہماری بیٹی ہوئی تہذیب ہمارا تقسیم شدہ تمدن، ہمارا بچا ہوا تن۔ ہر وہ چیز ہمارے ہی جسم سے کٹ کر ہمیں ملی ہے۔ مغربی سیاست کے جھوٹے بل میں دفن ہے۔ ہمیں ان سب کو نالانا ہے، جھاڑنا پونچھنا ہے، تروتازگی بخشنا ہے اور اس طوفان میں جس جس شے سے ہم محروم ہوئے ہیں اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں ان زخموں کی دیکھ بھال کرنا ہے جو ذرا سی غفلت پر ناسور بن جانے والے ہیں۔ سب سے بڑا گھناؤنا زخم ان عورتوں کا وجود ہے جن میں سے کچھ ہماری بزدلی کے باعث بے لگام شہوانیت کا شکار ہوئیں اور کچھ مخالفین کی ”شہروری“ کا نشانہ شوق بنیں۔ کہا جاتا ہے ایسی پچاس ہزار عورتیں موجود ہیں، مائیں، بہنیں اور پیپیاں ان میں سے چند ہزار کی بازیابی ہو چکی ہے۔ جو باقی ہیں ابھی تک ثبوت کے تنوروں میں ایندھن کا کام دے رہی ہیں۔

پچھلے دنوں قائدین ملت کے ایما، پر ان مظلوم و مقہور عورتوں کی بازیابی کی مہم بڑے زور شور سے شروع ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمیں اس کا اتنا زیادہ گلہ نہیں اس لیے کہ اس مہم کا انحصار زیادہ تر فریق ثانی کے دل کھلنے پر تھا لیکن اس بات کی شکایت ہمیں ضرور ہے کہ ان عورتوں کے متعلق جو ہمیں واپس مل چکی ہیں۔ نفسیات کی روشنی میں بہت کم غور کیا گیا ہے۔

ان گھائل روجوں کے لیے کسی جیل میں ایک واردہ مخصوص کر دینے سے اور تفریح کے لیے وہاں ایک عدد ریڈیو سیٹ لگا دینے سے یا کسی خوش پوش امیر زادی کے معائنے میں ان کی تقدیر کی ریفوگیری نہیں ہو سکتی اور پھر ان کے تاریک مستقبل کو روشن بنانے کے لیے یہ بھی کوئی حل نہیں کہ ان کو سپاہیانہ تعلیم دے کر ”فوجی گوروں“ کی تانیٹ بنا دیا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے اس نشان کو مٹانے کی کوشش کی جائے جو ان تقدیر کی بیٹیوں کی پیشانی پر حادثات کی سیاہی لگا گئی ہے اور اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے لیے اپنی معاشرت میں صحت افزا جگہ پیدا کی جائے۔

یہ عورتیں غریب ہوں یا امیر، کنواری ہوں یا بیواہی ہوئی، مال گاڑی کا نقصان رسیدہ اسباب نہیں جو انہیں کچھ دن گودام میں رکھ کر نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اگر کچھ مصرف سمجھ میں نہ آئے تو انہیں تلف کر دیا جائے۔

ہزاروں عورتوں کا سوال ہے جو کبھی ماؤں کی بیٹیاں، بھائیوں کی بہنیں اور شوہروں کی بیویاں تھیں۔ جس حالت میں یہ اب ہیں اس کی ذمہ دار سیاست کی اکھاڑے بازی ہے۔ مذہب کا وہ جنون ہے جس کی مثال انسانوں کی پچھلی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی اور کچھ نہیں تو ان عورتوں کے وجود کو اپنا ہی گناہ سمجھ کر ہمیں پردہ پوشی کرنی چاہیے۔

اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو ان عورتوں کا شکستہ حال ایک بہت ہی خوف ناک خرابی میں تبدیل ہونے والا ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں توجہ خانے منہ کھولے



ان کے استقبال کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں اس کے تصور ہی سے کانپ جانا چاہیے اور پھر وہ بچے ہیں جو کئی عورتوں نے اپنی مجبور کوکھ سے پیدا کئے ہیں۔ اس خود روپود کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کون ہے۔ کون ہوگا اور کون ہو سکتا ہے یہ آپ کو سوچنا ہے یہ مجھے سوچنا ہے، یہ ہمارے ان رہنماؤں کو سوچنا ہے جو اس سر زمین کے خاوند ہیں اور سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ وہ لوگ صرف سوچنے کی خاطر سوچتے ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا کیا مصرف ہے؟ یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان پر فوری تدبیر اور عمل کی ضرورت ہے۔ کرنی نشین فکر و عمل اور تن آسان تدبیر و تنظیم سے ہمارے مجلسی دائرے کا یہ چاک ہرگز ہرگز رونہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے تمام ماہرین نفسیات مل کر ان مظلوم عورتوں اور ان کی جبری اولاد کے لیے زندگی میں ایک صاف اور ہموار راستہ تلاش کریں تاکہ یہ سماج کے جذباتی قوانین کی ٹھوکروں سے بچے رہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ نازک مسئلہ اناڑیوں کے سپرد رہا تو اندیشہ ہے کہ حالات تاریک سے تاریک ہو جائیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ان عورتوں کے فوٹو شائع کرنے سے کس قسم کا اثر پیدا کرنا مقصود ہے۔ دیکھنے والے ان کے چہروں کی مصنوعی مسکراہٹیں ضرور دیکھتے ہیں لیکن سمجھنے والی بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ کاغذ ان کی آنکھوں کے وہ آنسو جو کہ وہ بہا چکی ہیں اور جو آئندہ بہانے والی ہیں۔ ہرگز خشک نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ان عورتوں کے وجود کی ایسی نامیادہ تشہیر نایت درجہ قابل اعتراض ہے۔ افسوس ہے کہ جو کام ہمیں خاموشی، سنجیدگی اور متانت سے کرنا چاہیے تھا۔ اس میں غیر ضروری بلند آہنگی برتی جا رہی ہے۔ یہ سراسر پھوہڑ پن ہے۔ جو حقیقت ہے اور

ایک بہت ہی تلخ حقیقت ہے ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں دینی چاہیے۔ یہ تلخ حقیقت انسانیت کی اس ذلت آفرین افتاد کے سوا اور کیا ہے جس نے ان معصوم عورتوں سے ایسا گھناؤنا سلوک کیا۔ ہمیں رجائی بن کر اسی انسانیت سے رجوع کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے پہنچائے ہوئے نقصان کی تلافی کر سکے۔ انسانیت کا گناہ سب انسانوں کا گناہ ہے۔ وہ عظیم ترین گناہ جو چند گمراہ انسانوں سے سرزد ہو چکا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اس کا غناہ ادا کریں کہ اسی میں ہماری ان عورتوں کی، ان کے بچوں کی، پاکستان اور اورہندوستان کی بھی نجات مضمحل ہے۔

ہم جانور پال سکتے ہیں۔ حیوانوں کو اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان عورتوں اور ان کے بچوں کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب سب سے پہلے ہمارے رہنماؤں کو دینا چاہیے تاکہ عوام کو جو تقلید کے عادی ہیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کا موقع ملے۔

☆☆☆☆☆

## ایمان و ایقان

### یو این اور یڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں سے بول رہے ہیں، امن پسند لوگ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ روس اور امریکہ کے تنازے کا خاطر خواہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ طے پایا ہے کہ ان دونوں حکومتوں کی ایسی طاقت کی اوپن انیر نمائش ہو۔ اس ڈنگل میں جس کے دم خم دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ دنیا کی باگ ڈور تھامنے کا اہل قرار دیا جائے گا۔ چار بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے مسنن اس ڈنگل میں حصہ لینے کے لیے بذریعہ جٹ پروپلڈ ہوائی جہاز روانہ کر دیئے ہیں۔ قوی امید ہے کہ دنیا کے اس سب سے بڑے تنازے کا فیصلہ دوستانہ فضا، میں بطریق احسن ہو جائے۔

### یو ایس اے ریڈیو

ہم چار بڑی آزادیوں کی کوکھ سے بول رہے ہیں، کامیابی کی جھیل کی گہرائیوں میں ہمارے اور روس کے تنازے کا جو فیصلہ ہوا ہے۔ اس وقت تک کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک ایسی طاقت دریافت کرنے کے معاملے میں فریق ثانی ہمیں مجتہد تسلیم نہ کر لے۔ ہم ڈنگل اڑنے کے لیے بسرو چشم تیار ہیں لیکن

اکھاڑے میں پہلے ہمارا دم مقابل ہمیں اپنا استاد تسلیم کر لے۔

## یو ایس ایس آر ریڈیو

ہم ہتھوڑے اور درانتی کی آواز کے ساتھ بول رہے ہیں۔ فریق ثانی کے بلند باگ دعوے ہم سن چکے ہیں۔ پدم سلطان بودکا زمانہ لد گیا۔ امریکہ کو بھس نے دریافت کیا تھا لیکن اس غریب کے فلک کو بھی ایسی طاقت کا علم نہیں تھا۔ ہم اس میدان میں طفل کاتب ہی ہی لیکن پنچڈال کر دیکھ لیا جائے کہ طاقتور کون ہے۔

## یو این اور ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل میں خوشی کے گیت گاتے اور ڈبکیاں لگاتے ہوئے بول رہے ہیں۔ ہمارے خوشی کے گیت کے پہلے بول یہ ہیں کہ روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کو چند سیاسی سٹھنیاں دینے کے بعد یورینیم اور پلوٹونیم پر ہاتھ رکھ کر صاف ڈگلڑنے کا حلف اٹھالیا ہے۔

بریں مرثدہ گر جاں فشانم رواست

## یو ایس ایس آر ریڈیو

یورینیم اور پلوٹونیم پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کا احترام کریں۔ چنانچہ بین الاقوامی قواعد و ضوابط کے پیش نظر مسابقت کے

ڈنگل میں حصہ لینے سے پہلے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ نمونے کے طور پر ایک ایٹم بم امریکہ روانہ کر دیں تاکہ وہاں کے ماہرین اچھی طرح ٹھونک بجا کر اس کی طاقت کا اندازہ کر لیں۔ جس سے ہمارے دعوؤں کا جھوٹ سچ ان پر واضح ہو جائے گا۔ نمونے کے اس ایٹم بم کی روانگی کے وقت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

### یو ایس اے ریڈیو

اجتہاد اور پہل ہمیشہ ہمارا حصہ رہا ہے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ایٹم بم کا نمونہ پہلے یہیں سے روانہ کیا جائے۔۔۔۔۔ چنانچہ چار بڑی آزادیوں کے نفاذ پر چوٹ لگا کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے کہ آج چار بج کر سو اچھیالیس منٹ، گرین وچ نام پر چچا سام اپنے بہترین اور خوبصورت ترین ایٹم بم کا نمونہ روس کے ماہرین کی جانچ پڑتال کے لیے روانہ کر دیں گے۔

### یو ایس ایس آر ریڈیو

(ہوم سروس) امریکہ۔ سیاٹم بم کی روانگی پر متحدہ جمہوریہ روس میں جو خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سرخ قائدین کے نزدیک بہت ہی شرمناک ہے ہمارے سائنس دان جو ایٹم بم کی رگ رگ اور نخی نخی سے واقف ہیں اس کے استقبال کے لیے چشم براہ ہیں۔

## یو ایس ایس آر ریڈیو

دراستی اور تھوڑے کی مار اور کٹ کا فیصلہ آج ہو جائے گا ہم نے بھی آج چار بج کر سو اچھیالیس منٹ، گرین وچ ٹائم پر اپنا برا بھلا ایٹم بم نمونے کے طور پر امریکہ کے ماہرین کی خدمت میں روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے یہ بم 500 میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسافت طے کرے گا۔

## یو ایس اے ریڈیو

(ہوم سروس) ہمارے سائنس دانوں نے عظیم ترین دوربینوں کے ذریعے سے روس کے نیچے ہوئے ایٹم بم کا معائنہ کر لیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ اسے واپس بھیجنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے لوگوں کو بے وجہ منظر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

## یو ایس اے ریڈیو

ہمارا بھیجا ہوا نمونے کا ایٹم بم اس بم سے دس ہزار گنا بڑا ہے جو ہم نے بیروشیما پر گرایا تھا۔ امید ہے روس کے ماہرین نے اب تک اس کا اندازہ کر لیا ہوگا جو ایٹم بم روس نے ہماری طرف روانہ کیا ہے اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

## یو ایس ایس آر ریڈیو

قد و قامت اور ڈیل ڈول کی طرف ازمنہ عتیق کے اوگ دیکھتے تھے۔ بعد جدید میں اس پرانے گز سے کسی کی طاقت ماپنا ازحد منجھا خیز ہے۔ امریکہ کے ایٹم بم کی حقیقت ہمارے سائنس دانوں نے دور ہی سے دیکھ کر معلوم کر لی ہے اور وہ گز بھی اپنے معمولوں میں تلاش کر لیا ہے جس سے امریکہ کی یہ سونفات شکرینے کے ساتھ لوانائی جاسکے گی۔

## یو ایس اے ریڈیو

ہماری تیاریوں میں صرف ایک انچ کی کسرتھی مگر اب ہم بصد فخر و ابتهاج یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے قابل سائنس دانوں نے روس کے ایٹم بم کو عین جب کہ وہ ہماری سرحدوں میں داخل ہونے والا تھا کہ بمک ریز کے زور سے دھکا دے کر واپس روس بکھیج دیا ہے۔

## یو ایس ایس آر ریڈیو

ہم نے امریکہ کے ایٹم بم کو ایسا ریا دیا ہے کہ پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آنے کے بدلے اب یہ سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے واپس جا رہا ہے لیکن اس کے برعکس ہمارا ایٹم بم بہت سست رفتاری سے ہماری پاس واپس آ رہا

- ہے۔

## یو ایس اے ریڈیو

رفتار تیز اور سست کرنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ حکم دے دیا گیا ہے کہ روسی ایٹم بم کی واپسی کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ کر دی جائے۔

## یو این اور ریڈیو

ہم کامیابی کی جھیل کی نیلا ہٹوں سے بول رہے ہیں اور دنیا کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ ہم نے ڈگنل کا موقع ہی نہیں آنے دیا اور روس اور امریکا کی ایٹمی طاقتوں کو برابر چھڑا دیا ہے۔ وہ دو ایٹم بم جو ٹرینین نے نمونے کے طور پر ایک دوسرے کو بھیجے اور واپس کیے تھے۔ ابھی تک فضاؤں کو چیر رہے ہیں۔ لیکن سیکورٹی کونسل کی غمراش پر خیر۔ گالی کے اشارے کے طور پر دونوں طاقتیں ان بموں کا رخ کسی اور طرف پھیر دیں گی۔

## اے آئی ریڈیو

آج بھور سے پچھتم سیا یک بہت بڑا بھیا نک پونچھ والا اتارا آ کاش پر کلا اور آن کی آن میں ہمارے سروں پر آ کر لٹک گیا۔ جتنا میں اس کارن بہت ڈرا اور بھتے اپن ہو گیا ہے۔



## اے پی ریڈیو

مدارس سيارہ جس کے طلوع ہونے کی خبر اس سے پیشتر نشر کی جا چکی ہے۔ فضاؤں میں اسی طرح معلق ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آرہا ہے۔ حکومت نے اس کے بارے میں معتبر رپورٹ تیار کرانے کے لیے سکولوں کے تمام ہوشیار سائنس ماسٹروں اور کالجوں کے تمام اائق پروفیسروں کی ایک جماعت تیار کی ہے امید ہے کہ بہت جلد اس مدار سيارے کی وجہ نمود معلوم ہو جائے گا۔

## اے آئی ریڈیو

آکاش پر پونچھ والے تارے کے پگٹ ہونے سے جتنا میں بھے اور بھی ادھک ہو گیا ہے۔ پرتو بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جتنا کواشو اسن دایا ہے کہ اس بھی نگر گرہ کو نالنے کی یو جنانمیں سوچی جارہی ہیں بڑے بڑے پنڈتوں اور اچار یوں کو اس کٹھنائی کا بھید جاننے پر لگا دیا گیا ہے۔

## اے پی ریڈیو

سکول کے ماسٹروں اور کالج کے پروفیسروں نے سائنس کی ساری کتابیں چھان ماری ہیں مگر انمیں اس مدار ستارے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب

زمین کی طرف پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ سست رفتاری سے نیچے اتر رہا ہے۔ علماء دین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سیارہ قہر خدا ہے جو ہم پر نازل کیا ہے۔ چنانچہ عوام سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس بلا کو نالنے کے لیے خدائے عزوجل سے رجوع کریں۔ طے پایا ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے بڑے بڑے میدانوں میں لوگ جمع ہوں اور نئے مرد نامائیں۔

## اے آئی ریڈیو

جن پنڈتوں اور اچار یوں کو پونچھ والے ستارے کے بھید کی کھوج پر لگا دیا گیا تھا۔ اس پری نام پر پہنچے ہیں کہ مانو و گیان اس ستارے کے رس کو جاننے میں اسمرتھ ہے۔ پراچین رشیوں کی نمتی کے انوسار بھارت سرکار نے یہ نپے کیا ہے کہ کورو گھشتر کے اتہاسک میدان میں ایک مہان یگ رچایا جائے۔ اس یگ میں ویدوں کے دھرمدر پنڈت تتھا و دووان سملت ہوں گے۔ ایک مہان ہون کے لیے ساگری اکٹھی کی جارہی ہے۔ میسور کے سارے چندن کے بن کٹوا کر یگ استمان پر امائے جارہے ہیں۔ ایک وانی ویر نے ایک اکھٹین شدھ گھی کے پرتی دن دینے کا پرن کیا ہے۔ سادھوؤں تتھیا تریوں کے بھون آدی پر دس کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ پورن آشنا ہے کہ مہا پر بھو پر میسور کی اپا دیا سے یہ کٹھن گھڑی ٹل جائے گی۔

## اے پی ریڈیو

میدانوں میں نکتے سر اجتماعی دعائیں مانگنے، دس کروڑ کالے بکروں کی قربانی دینے اور تمام اولیاء کرام کے مزاروں پر نذر و نیاز اور چادریں چڑھانے کے ساتھ ساتھ حفظ ماتقدم کے طور پر زمین میں جگہ جگہ سرنگیں اور گڑھے کھودنے کا کام بھی جاری ہے۔ اگر خدا نخواستہ دندار سیارہ نیچے آ رہا تو یہ سرنگیں اور گڑھے خاطر خواہ بچاؤ کی صورت پیدا کر دیں گے۔

### اے آنی ریڈیو

مہمان گیگ پھلنا پوروک ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھارت سرکار کے رکھشا منتری نے جتنا کہ بچاؤ کے لیے بیس کروڑ آدمیوں کی ایک بھاری سینا کو ایک سرنگ کھودنے پر لگا دیا ہے جو پاتال تک جائے گی۔ اوٹکنا پڑنے پر یہ سرنگ سب زاریوں کے لیے رکھشا استمان کا کام دے گی۔

### ایس ایچ ریڈیو

ہم ساتویں آسمان سے بول رہے ہیں۔ پستیوں سے اطلاع وصول ہوتی ہے کہ وہاں دو بستیوں میں بڑے خسوع و خشوع سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ خدا ان کو انسان کے اپنے بنائے ہوئے تباہ کن بھوں سے نجات دلائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ذات رحیم و کریم ہے اور اس کے حضور صدق دل سے مانگی ہوئی دعا کبھی خالی نہیں جاتی لیکن پستیوں کی ان دو بستیوں کے باشندوں کے

ایمان و ایتقان کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ حفاظت کے لیے ایک ہاتھ دنا کے لیے آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے زمین میں گڑھے اور سرائیں کھودتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

## پردے کی باتیں

پردہ اٹھتا ہے:

بازار میں ایک آدمی سٹول پر کھڑا ہے منہ سے بھونپو لگائے اور ہاتھ میں بہت بڑی قینچی پکڑے چلا رہا ہے ”اگر میں نے کسی مسلمان عورت کو اس بازار میں بے پردہ گزرتے دیکھا تو اس قینچی سے اس کی چٹیا کاٹ دوں گا۔“

درزی کی دکان میں ادھڑ ادھڑ برقعے سے جا رہے ہیں۔ کام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری ہیں۔ ”یار جناح صاحب کی مشیرہ کیوں نہیں پردہ کرتیں؟“

”معلوم نہیں“

”وزیراعظم صاحب کی بیگم صلابہ بھی ہیں وہ بھی ننگے منہ پھرتی ہیں۔“

”امیر آدمیوں کو پردے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”کسی مولودی سے پوچھنا چاہیے۔“

-----

کالج میں مباحثہ ہو رہا ہے۔

لڑکی جذبات بری آواز میں کہتی ہے ”صرف عورتوں کے حقوق دبانے کی خاطر اور انہیں معاشرتی سرگرمیوں سے دور رکھنے کے لیے مردان پر پردہ حائل کرنا چاہتے ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے مسلمان عورتیں

مردوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیتی رہی ہیں۔۔۔۔۔ پردہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بہت بڑا ظلم ہے، وہ لوگ جو اس کے حامی ہیں۔ ان کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ پچاس ہزار عورتیں مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہیں کیا ان کی تباہی کا باعث یہ زبردستی عائد کیا ہوا پردہ نہیں ہے۔“

لڑکا میز پر مکہ مار کر کہتا ہے ”خدا کی قسم! میں پردے کا بااکل حامی نہیں میں چاہتا ہوں کہ یہ لعنت حرف غلط کی طرح مٹ جائے لیکن صرف بحث کی خاطر مجھے بڑے زور سے کہنا پڑتا ہے کہ پردہ عورت کے لیے اشد ضروری ہے۔ اگر عورتیں بے پردہ چلیں پھریں گی تو نظام معاشرت بااکل درہم برہم ہو جائے گا۔ فاسد خیالات کا دور دورہ ہوگا اور مرد بااکل حیوان بن جائیں گے۔ عورتوں کو صرف اسی خوف سے کہ مرد کہیں حیوان بن جائیں فوراً پردہ اختیار کر لینا چاہیے۔“

-----

گلی میں چھوٹے چھوٹے بچے اور چھوٹی چھوٹی بچیاں کھیل رہی ہیں۔ ایک بچہ دینتا ایک بچی سے کہتا ہے ”تمہیں شرم نہیں آتی، نگلی پھر رہی ہو، جاؤ برقع پہن کر آؤ“

بچی جواب دیتی ہے ”میں برقع نہیں پہنتی لیکن تم ننھے پاؤں کیوں پھرتے ہو؟“

-----

کافی ہاؤس میں ایک لمبے بالوں والا آدمی اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے ”پردہ لائے یعنی پردہ ہوتا ہے جہالت کا، پردہ ہوتا ہے غفلت کا، راز کا، گمنامی

کا۔۔۔ عورت جہالت نہیں، غفلت نہیں، راز نہیں، گمنامی نہیں۔۔۔۔۔ پھر اس کا پردہ کیا؟“

-----

بھڑیا خانے میں ایک داڑھی والا سامعین سے کہہ رہا ہے:  
”جکم بھینہ امر تو یہی ہے کہ عورت اپنی زینت چھپائے۔ استثنیٰ بھینہ امر نہیں ہے کہ فلاں حصہ جسم کا چھپایا جائے۔ استثنیٰ کے الفاظ میں ”الاما ظھر منھا“ صرف اس بات کا ہے کہ اگر زینت کا کوئی جزو اتفاق طور پر یا مجبوری سے ظاہر ہو جائے گا تو اس پر گرفت نہیں۔ اگر جسم یا آرائش کے کسی خاص حصے کو ظاہر کرنا نام طور پر جائز کرنا مقصود ہوتا تو آیت میں کہا جاتا کہ اپنی زینت کو چھپاؤ، بجز فلاں فلاں چیز کے۔۔۔۔۔ ”الاما ظھر منھا“ سے یہ مراد لینا کہ منہ اور ہاتھ کھلے رکھے جائیں صحیح نہیں۔ اس لیے کہ غیر ارادی طور پر اس سے بھی زیادہ حصہ جسم کا ظاہر ہو جانا قابل گرفت نہ ہوگا اور مجبوری نہ ہو تو سارے جسم کو چھپانا عورت کے لیے ضروری ہے۔“

-----

دیہات میں ایک جاٹ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے ”نیک بنختے! ایہہ چدر چھڈ  
برخانڑوا۔ او جیہڑا تمبووا انگ ہندا اے“

-----

ایک آدمی اپنے خواندہ دوست سے غیظ لکھوا رہا ہے:  
”جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!“

الحمد للہ! پاکستان قائم ہو چکا ہے اور شریعت اسلامی نافذ ہو چکی ہے جو تھیرکا رائے کا یہ گانا ”گھونگٹ کے پٹ کھول تو رہے یہاں لیں گے“ کو راضی ہونا چاہیے کہ یہ پردہ دار عورتوں کو بہکانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

-----

ٹی باؤس میں ایک ترقی پسند کہہ رہا ہے ”پردے کے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ستر پوشی کا خیال پہلے باوا آدم کے دل میں پیدا ہوا یا اماں حوا کے دل میں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ شروع شروع میں دونوں اس سے ناقل تھے لیکن جب ہانیل اور قانیل پیدا ہوئے تو باوا آدم کو اپنی بیوی کی ستر پوشی کا خیال آیا۔۔۔۔۔ اور انسان کا سب سے پہلا لباس انجیر کے پتوں سے تیار ہوا۔۔۔۔۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ عورت کے کس حصہ جسم کی ستر پوشی آدم نے سب سے پہلے ضروری سمجھی۔۔۔۔۔“

-----

بازار میں ڈھنڈو راپٹ رہا ہے

آج شام کو چھ بجے منٹو پارک میں جس کا اسلامی نام باغ عدن رکھا گیا ہے۔ مولانا گل داؤدی کے زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ ہو گا۔ جس میں بیگم لیاقت علی خان کے اس بیان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوگی جو انہوں نے بے پردگی کی حمایت میں دیا ہے۔

-----

مال روڈ پرنٹ پاتھ کے ساتھ گھاس کی روش پر ایک آدمی آلتی پالتی مارے



بیٹھا ہوا ہے اور اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے۔

”پردہ کرنے والی عورتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان کی ہے جو صرف اپنے رشتہ داروں سے پردہ کرتی ہیں، نامحرم مردوں سے انہیں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔ ایک قسم ان کی بھی ہے جن کا پردہ اپنی گلی کے مردوں تک محدود ہے۔ سارے شہر میں پردہ در بغل یا پردہ بدوش پھرتی رہیں گی لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی پردہ پوش ہو جائیں گی لیکن خطرناک قسم ان عورتوں کی ہے جو پردہ کرتی ہیں لیکن در پردہ پردہ نہیں کرتیں۔“

گھر میں ایک بزرگ اپنی اولاد سے مخاطب ہیں ”اس وقت ہندوستان میں میرا مطلب ہے پاکستان میں، دو لغزنتیں بہت عام ہیں۔ بے پردگی اور ترقی پسندی۔ دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے بے پردگی سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے اور ترقی پسندی سے خش نگاری“

سڑک پر ایک آدمی اخبار پڑھ رہا ہے۔

”لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے آج ایک آوارہ نوجوان کو جس کا نام اسلم ہے دفعہ 109 کے ماتحت دو ماہ قید سخت کی سزا دی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملزم برقع پہن کر میکلوڈ روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔“

تاگہ میں ایک برقع پوش لڑکی اپنی برقع پوش سہیلی سے کہتی ہے ”آج ہمیں



ٹھوڑی۔۔۔۔۔ اور وہ ہونٹوں کی جیتے جیتے لبو جیسی سرخی۔۔۔۔۔

ملکہ کے بت کے پاس ایک لڑکا اپنے دوست سے کہتا ہے:

”یہ نقاب کشائی کی رسم کیا ہے۔۔۔۔۔ جب مجسمہ تیار ہوتا ہے تو اسے کوئی نہیں ڈھاکتا۔ لیکن جو نبی نصب کیا جاتا ہے تو اس پر کالی چادر چڑھا دیتے ہیں اور کسی بڑے آدمی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کی نقاب کشائی کرے۔

میرا خیال ہے یہ پردے کا سلسلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“

ایک آدمی اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے ”میں پردہ کا حامی ہوں لیکن میں نے قبلہ دادا جان سے سنا تھا کہ علی گڑھ میں ایک دفعہ صرف اس لیے بلوہ ہو گیا تھا کہ ایک عورت بے پردہ باہر نکل آئی تھی۔۔۔۔۔ اس لیے بھی تم پردہ نہ کرو تو بہتر ہے۔“

دیوار پر ایک اشتہار چسپاں ہے:

برقعہ پہن کر بحفاظت چلنے کی تعلیم دینے والا پہلا اسلامی مدرسہ

ہم نے دیہاتی عورتوں اور ان خواتین کے لیے جو پردے کی عادی نہیں ہیں، برقع پہن کر سڑکوں پر بحفاظت چلنے پھرنے اور سائیکل چلانے کی تعلیم دینے کے لیے ایک سکول قائم کیا ہے۔ ایک مہینے کے اندر اندر ہر عورت کو ایک سپرٹ برقع

پوش بنانے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ آزمائش شرط ہے فیس بااکل واجب ہے دوران  
تعلیم میں برقعہ سکول مفت مہیا کرے گا۔

پروہ گرتا ہے

☆☆☆☆☆



ٹولنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے منہ سے کچھ اس قسم کا کلمہ نکلتا ہے ”لعنت“ یا ”حد  
ہوگئی“ آپ ضرور پوچھیں گے ”کیا بات ہے؟“  
”کچھ نہیں صاحب! سگریٹ کا ڈبہ مانگے میں رہ گیا ہے۔“  
”اوہ۔۔۔۔۔ فی الحال یہ شوق فرمائیے“  
اور دیر تک وہ آپ کے سگریٹوں سے شوق فرماتا رہے گا۔

## تیسری قسم

زید آپ کا دوست ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ وہ مفت نوش ہے ہر روز وہ  
آپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور بڑے پر تکلف انداز میں کہتا ہے ”لاؤ بھئی  
اب سگریٹ پلاؤ“

## چوتھی قسم

آپ کسی باغ میں بیچ پر بیٹھے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہی ایک اور صاحب بیٹھے  
کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ آپ جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے  
ہیں۔ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے صاحب مفت نوش ہیں، فوراً جیب سے دیا سلامتی  
نکالیں گے اور جلا کر آپ کی طرف بڑھادیں گے۔ آپ ان کا شکریہ ادا کریں گے  
اور سگریٹ کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھادیں گے۔

”شوق فرمائیے“



ذرا جارحانہ قسم کی ہے آپ اپنے دوستوں کے ساتھ وائی ایم سی اے ہال کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر انگلیوں میں تھامتے ہیں۔ دیا سمانی ساگانے ہی کو ہیں کہ ایک راہ چتا جلدی سے آپ کے پاس آتا ہے انگلیوں میں سے سگریٹ نکال لیتا ہے۔ دیا سمانی طلب کرتا ہے اور سگریٹ ساگا کر یہ جاوہ جا۔ آپ سمجھتے ہیں، پاگل تھا، چنانچہ دیر تک یہ عجیب و غریب حادثہ آپ کے اور آپ کے دوستوں کا موضوع سخن بنا رہتا ہے۔

## آٹھویں قسم

بڑی ڈھیٹ قسم ہے آپ تنگ آ کر کہتے ہیں ”بھئی اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے؟“  
جواب ملتا ہے ”میں قسم کھا چکا ہوں کہ اپنی جیب سے کبھی ایک سگریٹ بھی نہیں خریدوں گا مہفت کے مال کا کچھ اور ہی مزہ ہے۔“

## نویں قسم

آٹھویں قسم سے کچھ مختلف ہے آپ تنگ آ کر پوچھتے ہیں ”بھئی تم اپنی جیب سے کیوں نہیں پیتے؟“  
جواب ملے گا ”ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ سگریٹ میرے لیے بہت ہی مضر ہے۔ اپنی جیب میں سگریٹ پڑے ہوں تو مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتا اس لیے کبھی



کبھار دو سنتوں سے مانگ کر پی لیتا ہوں۔“

## دسویں قسم

قصیدہ گو مفت نوشوں کی ہے ”بھئی خدا کی قسم! منٹو بادشاہ ہے سگریٹوں کا دنیا بھر میں آپ کو اچھا سگریٹ نہ ملتا ہو لیکن منٹو کے پاس ضرور ہوگا۔۔۔۔۔ اور دوست! دیکھیں آج کل کیا پیتے ہو؟“

”بہت ہی معمولی برانڈ ہے کیپسٹن“

”تم اور کیپسٹن پیو، ضرور اس میں بھی کوئی بات ہوگی۔۔۔۔۔ اور دیکھیں“

## گیارہویں قسم

ایک دو سگریٹوں پر نہیں پورے ڈبے پر حملہ آور ہوتی ہے ”بھئی معاف کرنا میں تمہارا ڈبہ لیے جا رہا ہوں میرا دندان ساز کے یہاں رہ گیا ہے“ یا ”وہ ڈبے مجھے دے دو، میرے پاس کل یا پرسوں تک آنے والے ہیں، لوٹا دوں گا“

## بارہویں قسم

وہ ہے جس کو دیکھتے ہی لوگ اپنے اپنے سگریٹ زور سے تھام لیتے ہیں یا پھر اپنا بھرا پیکٹ خالی ظاہر کر کے پچینک دیتے ہیں۔

## تیرہویں قسم

وہ ہے جو ٹھوڑی دیر آپ سے باتیں کریں گے اور رخصت ہوتے وقت زمین پر سے آپ کا پھینکا ہوا پیکٹ یہ کہہ کر اٹھالیں گے ”بچے کے لیے لے جاتا ہوں اسے خالی ڈبیوں سے کھیلنے کا بہت شوق ہے۔“

☆☆☆☆☆

## پٹانے

### ایک خبر

پاکستان میں بچوں کو آتش بازی کی لعنت سے بچانے کے لیے حال ہی میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا نام ’انجمن انسداد پٹانہ جات‘ ہے اس کا صدر دفتر بارود خانہ میں قائم کیا ہے امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد اس کی شاخیں روس، امریکہ اور انگلستان میں بھی قائم کر دی جائیں گی۔

### دوسری خبر

اس سال آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی تعداد پچھلے سال سے دو گنا بتائی جاتی ہے۔ پاکستانی والدین نے اس پر بہت تشویش کا اظہار کیا ہے اور حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ آتش بازی سے جل کر مرنے والے بچوں کی ایک سالانہ تعداد مقرر کر دے۔ حکومت سے اسی سلسلے میں چنانچہ ایک نئی وزارت قائم کرنے کی استدعا بھی کی گئی ہے اس وزارت کا عہدہ سنبھالنے والے وزیر پٹانہ کہا جائیں گے۔ سنا ہے کہ مشرقی پنجاب کے دو بہت بڑے مہاجر آتش بازوں میں یہ وزارت حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ ہوں گے۔

## ایک مکالمہ

ایک باپ: آتش بازی چلانا ٹھیک نہیں

ایک بچہ: کیوں؟

باپ: پیشہ ضائع ہوتا ہے

بچہ: اتنی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں کیا ان میں پیشہ ضائع نہیں ہوتا

## دوسرا مکالمہ

ایک بچہ: میں آتش بازی نہیں چلاؤں گا

ایک باپ: کیوں؟

بچہ: میں بہت بر خوردار ہوں

باپ: کیا کہا؟ چلو ڈاکٹر کے پاس، ضرور تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

## ایک سبق

سردیوں میں مولیٰ نہ کھاؤ اور عید شب رات پر آتش بازی نہ چلاؤ

## دوسرا سبق

گرمیوں میں مولیٰ کھاؤ اور عید شب رات چھوڑ کر ہر روز آتش بازی چلاؤ۔

## ایک تحقیق

نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ خوشی کا پر جوش مظاہرہ کرنے کے لیے پٹانے چھوڑنا اور آتش بازی چلانا انسان کی جبات ہے۔ بیس ہزار سال قبل از مسیح کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلا پٹانہ ایک انسان کی کھوپڑی کا چلایا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب لوگوں کو احساس ہوا کہ ایسا پٹانہ چلانے سے ایک انسان کم ہو جاتا ہے تو دوسرے پٹانے ایجاد ہونے شروع ہوئے۔

## دوسری تحقیق

نفسیات کے ماہرین تحقیق و تدقیق کے بعد اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں انسان نے درندوں کو ڈرانے کے لیے پٹانے اور آتش بازیاں ایجاد کی تھیں لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگا تو یہ پٹانے اور آتش بازیاں گولوں اور بھوں کی شکل اختیار کر گئیں۔

## ایک فرمائش

ایک بچہ: اباجی! مجھے یہ پٹانہ نہیں چاہیے  
ایک باپ: کیوں؟

بچہ: بڑے زور سے پھٹا ہے میں ڈر جاتا ہوں، کوئی ایسا پٹاخہ لادتیجئے جو زور سے نہ پھٹے۔

## دوسری فرمائش

ایک بچہ: اباجی! ایٹم بم کیا ہوتا ہے؟  
ایک باپ: دنیا کا سب سے بڑا پٹاخہ  
بچہ: مجھے ایک لادتیجئے شبِ برات پر چلاؤں گا

## ایک سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا ”  
پیر و مرشد میں شاہِ عالمی کے پاس رہتا ہوں یہ میرا بچہ ہے خدا معلوم اسے کیا وہ گیا  
ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جنات کا سایہ ہے پٹاخے کی آواز سن کر جی اس پر تشخ کے  
دورے پڑنے لگتے ہیں۔“

## دوسرا سایہ

ایک آدمی اپنے کم سن بچے کو ساتھ لے کر ایک فقیر کے پاس گیا اور کہنے لگا ”  
پیر و مرشد۔۔۔۔۔ میں مہاجر ہوں امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے اس بچے کے لیے  
کوئی تعویذ دیتجئے۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے۔ ادھر ادھر سے چیزیں اکٹھی کرتا



## کارل مارکس

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب  
نیست پیغمبر و لیکن در بغل وارد کتاب  
(اقبال)

تمام دنیا کی نگاہیں آج کل روس پر جمی رہتی ہیں۔ آج سے پہلے بھی جمی رہتی تھیں مگر ان نگاہوں میں تمسخر کی ایک جھلک تھی۔ ایک قسم کا استہزا تھا۔ یورپ میں سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والے بانکے، روس کے مزدوروں کی جدوجہد دیکھتے تھے اور زیر لب مسکراتے تھے۔۔۔۔۔ روس میں صدیوں کے غلاموں نے جب اپنی زنجیروں کا لوبا گلا گلا کر ایک نئی سلطنت کی بنیادوں کو پانا شروع کیا تو آزاد قوموں نے کئی بار ان کا منہ کھا اڑایا۔۔۔ اپنا گھر درست کرنے کے لیے جب ان لوگوں نے گرم جوشی کا اظہار کیا تو بنے بنائے اور بے سجانے گھروں میں رہنے والے کھلکھا کر ہنستے رہے۔ وہ کوشش جو کبھی دیوانگی پر مہمول کی جاتی تھی۔ وہ سچی جو کبھی ناممکن اور بے شریعتین کی جاتی تھی۔۔۔۔۔ وہ سلطنت جو کبھی مزدوروں کا ایک خیال خام سمجھی جاتی تھی۔ معرض وجود میں آئی۔۔۔۔۔ سیاست کی ٹیڑھی ٹوپی پہننے والوں، مذہب کا لمبا جبہ زیب تن کرنے والوں، آزاد اور غلام قوموں شکستہ جموں پیڑوں اور مرمریں محلوں میں رہنے والوں نے دیکھا۔۔۔۔۔ وہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کو ”سوویٹ روس“ کہتے ہیں۔

سوویٹ روس اب خواب نہیں خیال خام نہیں دیوانہ پن نہیں۔۔۔۔۔ ایک



ٹھوس حقیقت ہے۔۔۔۔۔ وہ ٹھوس حقیقت جو ہٹلر کے فوئڈی ارادوں سے کئی ہزار میل لمبے جنگی میدانوں میں لکرائی اور جس نے فاشیت۔۔۔۔۔ آہن پوش فاشیت کے نکلنے نکلنے کر دیئے۔۔۔۔۔ وہ اشتراکیت جو کبھی سر پھرے لوٹڈوں کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ وہ اشتراکیت جو کبھی دل بہاؤے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔۔۔۔۔ وہی اشتراکیت جو جنگ دین اور رنگ انسانیت یقین کی جاتی تھی۔ آج روس کی وسیع و عریض میدانوں میں بیمار انسانیت کے لیے امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی ہے۔ یہ وہی اشتراکیت ہے جس کا نقشہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کارل مارکس نے تیار کیا۔۔۔۔۔ قابل احترام ہے یہ انسان جس نے اپنی ذات کے لیے نہیں، اپنی قوم کے لیے نہیں، اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے، ساری انسانیت کے لیے، مساوات اور اخوت کا ایک ذریعہ تلاش کیا۔

جس طرح کچھڑ میں کنول پیدا ہوتا ہے اسی طرح سرمایہ پرست یہودیوں کے ایک گھرانے میں سرمایہ شکن کارل مارکس پیدا ہوا۔۔۔۔۔ پانچ منی سن اٹھارہ سو اٹھارہ کو۔۔۔۔۔ اچھی بچی تھا کہ اس کے متعلق باپ نے یہ رائے قائم کی کہ یہ بڑا ہو کر شیطان نکلے گا۔۔۔۔۔ کارل مارکس بڑا ہو کر شیطان کا ایسا فرشتہ اس کا کچھ اندازہ تو ہماری موجودہ نسلیں کر چکی ہیں قطعی فیصلہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔۔۔۔۔ اس مختصر فوج میں جو اب آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ہم اس شیطان یا فرشتے کے مختصر سوانح حیات نیم سوانح حیات نیم ڈرامائی شکل میں پیش کریں گے۔

باپ: خدا ہمارے حال پر رحم کرے۔۔۔۔۔ تمہارے اس لڑکے نے میرا

نام میں دم کر رکھا ہے۔

ماں: جیسا میرا ہے ویسا آپ کا ہے یہ آپ ہر وقت مجھے ہی کیوں طعنے دیتے رہتے ہیں۔

باپ: بھئی! میں بڑا پریشان ہو گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔۔۔۔۔ غبی ہوتا، کند ذہن ہوتا تو میں خاموش ہو کے بیٹھ جاتا مگر کم بخت ذہین ہے۔۔۔۔۔ بابا کا ذہین ہے۔ چاہے تو سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔  
ماں: مگر اس کا دل بھی کسی طرف لگے؟

باپ: اسی بات کا تو رونا ہے سکول میں بھی اس کے یہی چلن تھے۔ اب کان لچ میں داخل ہو کر تو اور بھی زیادہ آوارہ گرد ہو گیا ہے۔ تعلیم کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ بڑی بے فکری اور بے پرواہی سے یہ زمانہ جو اس کی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، گزار رہا ہے۔ ہزار بار سمجھا چکا ہوں مگر صاحبزادے کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔۔۔۔۔ وہ خاص مضمون یعنی قانون جو میں نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کی طرف سنتا ہوں، کچھ توجہ ہی نہیں دیتا۔ میں اس کا یہ ابا بانی پن کب تک برداشت کرتا رہوں گا۔ صبر کی ایک حد ہوتی ہے

ماں: تازہ خط میں اس نے آپ کو کیا لکھا ہے؟

باپ: (تمسخر کے ساتھ) ذہنی الجھنوں اور روحانی پریشانیوں کے باعث آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے کچھ دن ہسپتال میں رہے۔ وہاں سے واپس آ کر بھی جب آپ کی روحانی شکمش ختم نہ ہوئی تو مجھے لکھتے ہیں ”اباجی! میرے ذہن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اس انقلاب کی پوری





گئے۔ والد کی وفات کے بعد مارکس کی تعلیم بصدخرابی جاری رہی۔ آخر کار ایک فائدہ نیا نہ مضمون لکھنے پر اسے ”جینا یونیورسٹی“ سے پی ایچ ڈی کی سند مل گئی۔ چونکہ مارکس کے عقیدے کے بموجب علم و عمل ایک ہی شے کے دوزخ تھے۔ اس لیے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے فوراً سیاسی میدان میں جدوجہد شروع کر دی۔ زیٹا نگ نامی ایک اخبار کا مدیر بنا اور حکومت کی پالیسی پر اس شدت سے تنقید کی کہ اخبار ضبط کر لیا گیا۔

مارکس: روگی! میرے دوست ضابطی کے اس حکم پر مجھے قطعاً تعجب نہیں ہوا  
افسوس بھی کچھ زیادہ نہیں ہوا  
روگی: کیوں؟

مارکس: ضابطی کا حکم اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے۔ جب کسی قوم میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہونے لگیں تو تحریر و تقریر پر اسی طرح پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ”زیٹا نگ“ بند ہونے پر سنسرافسر نے کیا لکھا تھا؟  
روگی: کیا لکھا تھا؟

مارکس: میں خوش ہوں کہ مارکس کے دست بردار ہو جانے کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج میں نے اپنا تمام کام ایک چوتھائی وقت میں ختم کر لیا۔  
روگی: تم نے ادارت سے استعفیٰ کیوں دیا؟

مارکس: اور کیا کرتا بھائی ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم پر غلامی ہو مجھ سے کام نہیں ہو سکتا میرا دل گھٹنے لگتا ہے آزادی کے لیے سویوں سے لڑنا مجھے پسند

نہیں۔ میں حاکمِ حقیقہ کی بے رحمی اور بے وقوفی اور اپنے ہم عصروں کی جی حسدوری چاہوں گی بہانہ سازی اور بے کار کے بحث مباحثے سے تنگ آ گیا ہوں جرمنی میں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ خدا کی قسم! کچھ نہیں کر سکتا، اس ملک میں رہنا اپنی توہین ہے، ذلت ہے۔

روگی: تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

مارکس: سوچ رہا ہوں کہ کوئی رستہ نکل آئے آج کل مفت کی پریشانی اور خواہ مخواہ کی بھٹوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اب میرے کنبے والے بے کار میری شادی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ کوئی انہیں سمجھائے تو کیسے سمجھائے؟۔۔۔۔۔ عشقیہ جذبات برطرف میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی سے بے پناہ محبت ہے آج ممکن ہوئے سات برس ہو چکے ہیں۔ وہ بے چاری اپنے اور میرے عزیزوں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہے مگر وہ ایسے خردماغ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

روگی: جینی کے رشتہ دار اس شادی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

مارکس: تم یہ بھی نہیں سمجھتے بھائی! وہ لوگ برلن کی حکومت کی اسی قدر عزت کرتے ہیں جتنی اپنے آسمانی باپ کی اور میں حکومت کا بیری بہت بڑا دشمن ٹھہرا اس ڈھونگ کا رہنے میرے عزیز تو وہ بھی اپنے انفرادی مفاد کے پیش نظر اس رشتے کے خلاف ہیں۔ کئی برسوں سے میں اور جینی اس شادی کے معاملے میں اپنے سے تلخی عمر والوں سے بحث کر رہے ہیں لیکن بدتموں کی اس دلیل کا کیا کیا جائے جو وہ ہر بات میں سامنے لے آتے ہیں

”یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے، اس وقت سمجھو گے“

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی عمر تک پہنچ کر جینی سے شادی کروں۔

روگی: میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے ایک اخبار جاری کروں۔ اگر یہ سکیم

پوری ہوگی تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا

مارکس کے دوست روگی کی سکیم نے عملی جامہ پہن لیا اس نے ایک اور اخبار

نکاالا اور مارکس کو پانسو تھیلر ماہانہ پر اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ فکر معاش سے آزادی

ہوئی تو مارکس نے انیس جولائی اٹھارہ سو تینتالیس میں جینی سے شادی کر لی اور

پیرس چلا گیا۔ یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ مارکس نے دن گزارنے کے لیے ایک

اخبار کے ادارے میں کام کرنا شروع کر دیا یہاں اس کی ملاقات مشہور شاعر ہانس

سے ہوئی۔ ہانسے اگرچہ جرمن تھا لیکن فرانسیسی اس کو اپنا قومی شاعر مانتے تھے

جب شاعر نے پروشا کی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف متواتر گیارہ نظمیں شائع

کرائیں تو حکومت پروشانے فرانس پر اثر ڈال کر اخبار کے مدیروں کے خلاف

جن میں مارکس بھی شامل تھا، جلا وطنی کا حکم صادر کر دیا۔ مارکس اپنی بیوی سمیت

بروسلز چلا گیا۔

بیوی: اب یہاں گزارے کی کیا صورت ہوگی یہ لوگ ہمیں کہیں بھی چین نہیں

لینے دیتے۔

مارکس: کچھ فکر نہ کرو اللہ میاں نے بندوبست کر دیا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو، ابھی

میرے شفیق دوست فریڈرک اینجلز کا خط آیا ہے

بیوی: (خوش ہو کر) کیا لکھتے ہے





باوجود انجیلز کی کسی نفسی کے یہ ماننا پڑتا ہے اور جیسا کہ خود مارکس تسلیم کرتا ہے ابتداء میں اقتصادی میدان انجیلز نے دیا اور کارل مارکس نے لیا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ خیر، برسوں اس زمانے میں بے الاوائی بورژوائی رجحانات کا مرکز تھا اور اس لیے کمیونزم کی نشرو اشاعت کے لیے بہترین جگہ تھی۔ یہاں مارکس نے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ 24 فروری 1848ء کو فرانس میں انقلاب ہو گیا بادشاہ فرانس کو جو حادثات پیش آئے۔ انہوں نے یورپ کے تاجداروں کو ڈرا دیا۔ چنانچہ ہیلجیم کے بادشاہ کے حکم سے مارکس اور اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے دن رہائی ملی تو جلاوطنی کا حکم صادر ہو گیا۔ مارکس نے پھر پیرس کا رخ کیا اور اپنے چند انقلابی دوستوں کی مدد سے اخبار نکالا جس سے اس کی شہرت عام ہو گئی مگر اس طوفان میں یہ چراغ کب تک روشن رہ سکتا ہے۔ فوراً ہی حکومت کا تشدد شروع ہو گیا۔ اخبار کے حصہ داروں نے ڈر کے مارے مالی امداد سے انکار کر دیا لیکن ان مشکلات کے باوجود مارکس نے اخبار بند نہ کیا۔ باپ سے ترکے میں جو سات ہزار تھمیلر ملے تھے۔ اس پر نمبر لگا دیئے لیکن دو چار دن ہی میں اخراج کا حکم آ گیا 19 مئی کو مارکس نے آخری انقلاب نمبر نکالا اور اخبار بند کر دیا۔

مارکس: ہمیں ستانے کے لیے حکومت یہاں کیوں ترستی ہے۔ جھوٹ اور افترا کے پل کیوں باندھتی ہے۔ ہم تو خود جلا دیں اس لیے دوسروں سے رحم کی امید نہیں رکھتے جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے یہاں اور حیلے نہیں تراشیں گے۔

دوست: اخبار بند ہونا تھا، سو گیا، اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟

مارکس: ارادہ کیا ہے۔ دماغ متزل ہے ہوش و حواس قائم نہیں۔ قرض خواہوں سے چھٹکارا ملے تو کچھ سوچوں بھی مزدوروں اور لکڑکوں کی تنخواہیں ادا کرتے کرتے میرا کچھ نکل گیا ہے۔ بیوی کے پاس کچھ زیورہ گئے تھے۔ ان کو گروی رکھ کر اتنے دن گزارہ کیا ہے۔ ایک دوست کو مالی امداد کے لیے لکھا ہے۔ اس نے چند جمع کرنا شروع کر دیا۔

دوست: تو کیا ہوا روپیہ کسی طرح تو آچاہیے۔

مارکس: نہیں بھائی! مجھے یہ طریقہ منظور نہیں میں برعسرت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن عوام سے بھیک مانگنا کسی طرح بھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ وہ میری خاطر چندہ جمع کر رہا ہے تو خدا کی قسم! مجھے بہت دکھ ہوا میں نے فوراً لکھا کہ ایسی امداد مجھے نہیں چاہیے۔ میں نے اس سے مانگا تھا۔ دوسروں سے مانگنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

دوست: کیا پیرس میں رہنے کا ارادہ ہے؟

مارکس: نہیں مطلق نہیں جو نہی زاوارا کا بندوبست ہوا میں یہاں سے لندن چلا جاؤں گا

23 اگست کو مارکس نے فرانس کو الوداع کہی اور لندن چلا آیا۔ یہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا جو مغلسی کے باعث ایک سال کے اندر اندر مر گیا۔ چاروں طرف مصائب ہی مصائب تھے لیکن ان کی موجودگی میں بھی مارکس نے اپنے علمی مشاغل جاری رکھے۔ صبح نو بجے لندن کی لائبریری میں چلا جاتا تھا اور شام کے سات بجے لوٹتا تھا۔۔۔ وہ اپنی مشہور کتاب ”اقتصادیات پر تنقید“ لکھ رہا تھا،

اس زمانے میں تقدیر کچھ مسکرائی تو ایک دوست کے توسط سے امریکہ کے ایک اخبار کی رپورٹری مل گئی اور کچھ معاضی ملنے لگا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مارکس تخت بیمار ہوا۔

مارکس: کسی بیماری نے مجھے اتنا کمزور نہیں کیا جتنا کہ اس نامراد بیماری نے کیا ہے مہر تار متا بچا ہوں۔

دوست: اب آپ کے حالات کیسے ہیں؟

مارکس: (مسکرا کر) حالات اب ایسی تسلی بخش منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ نہ باہر جاسکتا ہوں کیوں کہ سب کپڑے گروئی پڑے ہیں۔ نہ گوشت کھاسکتا ہوں کیوں کہ جو رہی تھی وہ اس بیماری نے ختم کر دی ہے۔

دوست: چھوٹی لڑکی کا کیا حال ہے؟

مارکس: بے چاری کئی دن سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے بہت کمزور ہو گئی ہے شاید ہی بچے کیوں کہ دو اداروں کے لیے ایک پیسہ بھی پاس نہیں۔

دوست: اللہ رحم کرے

مارکس: ہاں اللہ ہی رحم کرے۔۔۔۔۔ بیوی بیمار، بیٹی بیمار، لڑکے کو بخار، روپیہ پیسہ پاس نہیں نفع سے بھر سے صرف روٹی اور آلو پر گزارا کر رہا ہوں۔ شاید اب یہ بھی نہ ملے اور فاقے کرنے پڑیں۔ کاغذ خریدنے کے لیے پیسے نہیں کہ مضمون لکھ کر اخبار کو روانہ کر سکوں۔ اب صرف یہ ہونا باقی ہے کہ مالک مکان گھر سے نکال دے کیوں کہ اس کے بائیس پونڈ میری طرف نکلتے ہیں۔

دوست: اگر اس نے واقعی نکال دیا؟

مارکس: تو بہت ہی اچھا ہو گا ان بائیس پونڈوں کا بوجھ تو میرے سینے سے اترے گا۔۔۔ لیکن مالک مکان یہ عنایت مجھ پر کیوں کرنے لگا۔ روٹی والے، دودھ والے، ہزری والے، قصائی، پرچون والے، ان سب کا قرضہ الگ رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نصیحتیں کب ختم ہوں گی۔ بڑے شرم کی بات ہے مگر چند روز سے مزدوروں سے قرض لے لے کر گزارا کر رہا ہوں۔ کیا کروں، ان سے بھی نہ مانگوں تو بھوکا مر جاؤں۔

دوست: آپ ہی کی ہمت ہے کہ مشکلات کے ان جھوم میں بھی اپنا کام کئے جا رہے ہو۔

مارکس: بوڑھائی طبقہ مجھے میرے مقصد سے ہٹا کر سونا مانے کی ترغیب دینا چاہتا ہے میں ان کو بتا چکا ہوں کہ وہ مجھے کبھی سکے بنانے کی مشین میں تبدیل نہیں کر سکیں گے۔ میں ہر مصیبت میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔

دوست: نگر روپیہ مانا بھی تو ضروری ہے

مارکس: روپیہ مانا چاہیے کہ ہم زندہ رہیں اور کچھ لکھ سکیں لیکن روپیہ مانے کے لیے ہمیں زندہ رہنا اور لکھنا ہرگز نہیں چاہیے۔

مغلسی کا یہ نام لیکن اپنے پیش نظر مقصد سے ایک لمبے کے لیے بھی مارکس کی نظر نہ ہٹی وہ ایک بندہ مومن کی طرح اعلان حق میں لگ ا رہا۔ کڑے سے کڑے امتحانوں میں سے گزر رہا پڑا مگر وہ ثابت قدم رہا۔ اس کی جان و دل سے پیاری بچی سامنے دم توڑ رہی تھی۔ خود فاقوں سے نڈھال تھا مگر مجال ہے کہ اس کے پائے استتعال میں ذرا سی بھی افزش آئی ہو۔



بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا تھا۔ ضرورت کا اظہار کروں گا تو کفن دفن کے لیے شاید کچھ دے دے۔

نیوی: جب بے چاری پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اس کو کوئی گہوارہ نصیب نہ ہوا۔ آج رخصت ہو رہی ہے تو تابوت نہیں۔۔۔۔۔

ایسے کئی چر کے مارکس نے سبے مگر ثابت قدم رہا۔ لندن کے دوران قیام میں کچھ سکون پیدا ہونا شروع ہوا تھا کہ اس کا اکلوتا لڑکا فوت ہو گیا۔ اس کا داغ مفارقت دے جانا قیامت تھا۔ مارکس کو اس سے بہت محبت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکے کی وفات پر پہلی بار اس کو محسوس ہوا کہ صدمہ کیا ہوتا ہے۔ اس حادثے کے بارے میں اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور کہا: تنبیگو کہتا ہے کہ دنیا میں جو واقعی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت کی جستجو اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ کوئی ذاتی نقصان یا صدمہ انہیں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کا بڑا آدمی نہیں لوں لڑکے کی موت نے میری روح اور میرے جسم کو ہلا دیا ہے، جسم اور روح متزلزل ہونے کے باوجود اس نے اپنی تصنیف کا کام جاری رکھا۔ وہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل سیاسی ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔ وہ اپنے اقتصادی نظریات کو کتابی صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ کتاب مکمل ہوئی تو مارکس کی مغلسی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

اکیس جنوری سن اٹھارہ سو انسٹھ کو ”اقتصادیات پر تنقید“ کا مسودہ بالکل تیار تھا مگر۔۔۔۔۔

مارکس: امریکہ کے اقتصادی آشوب کا بہت ہی برا اثر پڑا ہے۔ پہلے یہ ریڈیوں

اخبار و مضمون بیت اتھا۔ اب کم بخت ایک ہی لیتا ہے۔

بیوی: وہ روپیہ جو امی جان کے انتقال کے بعد میسر آئے اتھا ایک برس کے اندر اندر ہی ختم ہو گیا۔

مارکس: بھیجی بے شمار قرضے ادا کرنے تھے آدھا تو ان ہی میں اٹھ گیا ہو گا۔ خیر مگر اب سوچنا یہ ہے کہ اس مسودے کا کیا کیا جائے۔

بیوی: کوئی نہ کوئی چھاپ دے گا آپ کیوں اتنی فکر کرتے ہیں؟  
مارکس: فکر اس لیے کرتا ہوں کہ مسودہ بھیجنے کے لیے پیسے کہاں ہیں ٹکٹ بغیر  
بھیج دوں

بیوی: (ہنستی ہے) میں ٹکٹوں کا بھول ہی گئی تھی

مارکس: ایک ٹکٹ کہیں سے مل گیا تھا۔ سو انجنلز کو خط لکھا ہے اور اس سے کہا ہے کہ بھائی مسودہ روانہ کرنے کے لیے ٹکٹ چاہئیں کچھ روانہ کر دو تا کہ یہ کام امکانہ رہے (ہنستا ہے) حد ہو گئی ہے شاید ہی کوئی ایسا معترف ہو گا جس نے دولت پر کتاب لکھی ہو اور وہ خود دولت سے محروم رہا ہو۔۔۔۔ اس کتاب کی طباعت کا انتظام ہو جائے تو ارادہ ہے کہ انگریزی ریلوے کمپنی میں ملازم ہو جاؤں۔

بیوی: آپ سے یہ ملازمت نہ ہو سکے گی

مارکس: تو ایک صورت اور ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو دیوالیہ اعلان کر دوں دو لڑکیاں ہیں انہیں تم کسی امیر کے بچوں کو کھلانے کا کام دلو اور ہم تم دونوں کسی ”ورک ہاؤس“ میں چلے جائیں۔

بیوی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

مارکس: کیا کہہ رہا ہوں ”ورک باؤس“ ہم جیسے نادار انسانوں ہی کے لیے بنائے گئے ہیں اور مارکس کی لڑکیوں اور ان کے کھلائوں میں کیا فرق ہے جو کئی متمول گھرانوں میں نظر آتی ہے۔

”ورک باؤس“ میں جانے اور لڑکیوں کو کھلائے بنانے کی نوبت نہ آئی کیوں کہ سن اٹھارہ سو ساٹھ میں اینجلز کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وصیت کی رو سے وہ اپنے باپ کی فرم کا مالک بن گیا اور اس قابل ہو گیا کہ اپنے دوست مارکس کی زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے۔۔۔ اس دوران میں مارکس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بھی مارکس کے لیے کچھ چھوڑا۔ غرض یہ کہ غلٹی کا دور چھوڑے ہی عرصہ کے لیے ختم ہوا۔ اب فارغ البالی ہوئی تو اس نے 1864ء میں انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی۔ تمام دنیا کے مزدوروں کی تنظیم آسان کام نہ تھا۔ مارکس کو اس سلسلے میں بہت سردردی کرنی پڑی۔ چونکہ اس کام میں پڑ کر وہ آمدنی کی طرف سے بالکل نائل ہو گیا تھا۔ اس لیے غلٹی اور بیماری نے اس کے دروازے پر پھر دستک دی۔

بیوی: مجھے آپ کے دوست اینجلز سے پورا پورا اتفاق ہے ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ کم بخت کتاب ”سرمایہ“ ہی تمام آفتوں کا موجب ہوئی ہے۔

مارکس: مگر اب تو میں اسے ختم کر چکا ہوں مجھے پوری پوری امید ہے کہ سال کے آخر تک میری مالی حالت بہتر ہو جائے گی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے دراصل افسوس اس بات کا ہے کہ میری وجہ سے بے چارہ اینجلز بہت پریشان رہا۔ میری خاطر اسے کاروباری دنیا میں بہت تندی سے کام کرنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے نیگم اینجلز آمد نہ کرتا تو یہ کتاب میں کبھی نہ لکھی سکتا۔



بیوی: اب آپ نے پھر ان کو تکلیف دی ہے

مارکس: یقین جانو اگر از حد ضرورت نہ ہوتی تو میں اسے تکلیف نہ دیتا اپنی انگلیاں قلم کر دیتا جنہوں نے اس کو یہ خط لکھا اور امداد چاہی دوسروں کو تکلیف دے کر زندگی کے دن پورے کرتے رہنا واقعی بہت بڑی ذلت ہے لیکن یہ خیال اس ذلت کو دور کر دیتا ہے کہ ایجنڈا اور میں دونوں ایک کام میں برابر کے شریک ہیں۔

بیوی: آپ نے ایک بار کہا تھا کہ مزدور کی سی طرز رہائش اختیار کر لیں گے۔

مارکس: میں نے اس پر بہت غور کیا تم خود اب میری اس رائے سے اتفاق کرو گی، بالکل مزدوروں کی سی طرز رہائش ہمارے موجودہ حالات میں مصلحت کے خلاف ہے۔۔۔۔۔ اگر دو جوان لڑکیوں کی بجائے دو لڑکے ہوتے تو بخدا مجھے ایسی رہائش اختیار کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوتا۔

بیوی: آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے

مارکس: نہیں تو

بیوی: نہیں تو کیا۔۔۔۔۔ کئی بار آپ کہہ چکے ہیں کہ ناگہوں میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے ڈاکٹر بھی آپ سے یہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی صحت بہت گر گئی ہے، اب خدا کے لیے رات کا کام بند کر دیجئے۔

مارکس: رات کا کام بند کر دوں تو کہاؤں کہاں سے؟

بیوی: یہی تو آفت ہے بغیر کام کئے ایک پیسہ بھی نہیں مل سکتا

مارکس: کتاب چھپ جائے تو میرے دکھ و درد دور ہو جائیں گے۔ اس

صورت میں جب کہ مسودہ گھر میں پڑا ہے میں موت کی خوانہش بھی تو نہیں کر سکتا

بیوی: کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو؟

مارکس: وہ کتاب جس کے لیے میں نے اپنی صحت، اپنی خوشی اور اپنے بیوی بچوں تک کو قربان کر دیا۔ اگر میری موت کے بعد شائع ہو تو کیا مجھے فسوس نہ ہوگا تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو کہ بہت سے آدمی جو اپنے آپ کو عملی کہتے ہیں میری اس علمی مشغولیت کو بے اثر اور بے کار کہتے رہے ہیں۔ میں ان کی اس بے وقوفی پر ہنستا رہا ہوں۔ یہ میری ہنسی صرف اسی صورت میں کامیاب ہوگی اگر یہ کتاب چھپ گئی۔

بیوی: اصل میں یہی لوگ جو خود کو عملی آدمی کہتے ہیں بہت بڑے بے عمل ہیں مارکس: اگر میں ”سرمایہ“ کو مرتب کئے بغیر مرجاتا تو اپنے آپ کو انہی بے عمل آدمیوں کے زمرے میں شمار کرتا لیکن مجھ ایسے حساس انسان کے لیے ناممکن تھا کہ انسانیت کی چیخ سنتا اور خاموش رہتا۔ صرف وہی انسان دوسرے انسانوں کے دکھ درد سے بے پروا رہ سکتا ہے جس کی کمال موٹی ہو۔

بیماری سے نجات حاصل ہوئی تو 1876ء میں کارل مارکس خود اپنی تصنیف ”سرمایہ“ کا مسودہ لے کر ہمبرگ گیا۔ 12 اگست کو ”سرمایہ“ کی کاپیوں کی تصحیح کا کام ختم ہوا۔ پہلی جلد نکل آئی دوسری اور تیسری جلد میں ترمیم و ترمیم کا کام ہوتا رہا مگر کارل مارکس کے ہاتھوں سے قدرت کو جو کام کرانا تھا۔ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کی دنیا میں ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے اس کی رفیقہ حیات کا 2 دسمبر کو انتقال ہوا اور وہ خود 14 مارچ 1883ء کو بوقت سہ پہر اس جہان سے رخصت ہوا۔ 18 مارچ کو اسے دفن کیا گیا۔ اینجلز نے اس کی قبر پر اتر کر کرتے

ہوئے کہا۔

انجیلز: 14 مارچ سبہ پیر کو پونے تین بجے دنیا کا سب سے بڑا دماغ اٹھ گیا۔ اس کی موت سے پرولتاریہ جدوجہد اور تاریخ کے نظریہ واقفیت کو جو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ڈارون نے اگر قدرت کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا ہے تو مارکس نے سماج کے ارتقاء کا قانون دریافت کیا ہے۔ اس نے موجودہ سرمایہ دارانہ اور بورژوائی سماج کے محرکات بتائے ہیں اس نے ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان کو سیاست، علم، فن اور مذہب کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے سے پہلے کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر ملک کے دستور علوم و فنون اصول و قانون اور ایک حد تک اس کے باشندوں کی شریعت کے بنیادی اصول اس کے سماج کے اقتصادی حالات میں مضمر ہوتے ہیں اور اگر کسی ملک کے آئین قوانین اور مذہبی خیالات کی بابت معلوم کرنا ہو کہ وہ کیوں اور کس طرح پیدا ہوئے تو اس ملک کی اقتصادی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے کیوں کہ زمانے کے اقتصادی حالات ہی ان خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

## جون آف آرک کا مقدمہ

جون آف آرک کے سوانح حیات سے تو قریب قریب آپ سب واقف ہوں گے، 1429ء میں فرانس کی حالت بہت بری تھی۔ انگلستان کی فوج فرانسیسی سپاہیوں کو شکست پر شکست دے رہی تھی۔ ہر جگہ انگریزی فوج کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بنری پنجم کی وفات کے بعد بھی حالات درست نہ ہوئے۔ پیرس انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ چارلس ہفتم تخت سے بددل ہو گیا تھا۔ اس کے حمایتی جی چھوڑ کر تتر بتر ہو گئے تھے اور لنیز کے شہر کا محاصرہ ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا جائے کہ جون آف آرک، دیہات کی ایک سترہ سالہ لڑکی مردانہ وار آگے بڑھی۔ سیدھی چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پاس گئی اس سے کہنے لگی کہ مجھے خدا نے تیری مدد کے واسطے بھیجا ہے شروع شروع میں کسی نے اس کا اعتبار نہ کیا مگر کچھ دیر بعد اس نے فرانس کی مردہ فوج میں نئی روح پھونک دی۔ زرہ بکتر پہنے، ہاتھ میں جھنڈا لیے، گھوڑے پر سوار اس نے کئی میدان جیتے اور لنیز کے شہر پر اس انگریزوں کا محاصرہ اٹھ گیا۔ اس کے بعد فتح و نصرت ہر قسم پر فرانسیسی سپاہیوں کے پاؤں چومنے لگی۔ چند مہینوں کی لگاتار کوششوں کے بعد 18 جولائی کو وہ چارلس ہفتم کی رسم تاج پوشی میں شریک تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جون آف آرک نے واپس دیہات میں چلے جانے کی خواہش ظاہر کی مگر بادشاہ فرانس نے قبول نہ کی اور اصرار کیا کہ وہ اس کے پاس ہی رہے پھر جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ انگریزوں کے قائم مقام ڈیوک آف بیڈفورڈ کی طاقت اور شاہ فرانس

کی سستی اور کم قیمت کے باعث حالات نے پلٹا کھمایا۔ پیرس پر انگریزوں نے حملہ کیا جس میں جون آف آرک زخمی ہوئی۔ ایک آدمی بستاروی وندوم نے اسے گرفتار کر لیا۔ انگریز جو اس سے بہت خائف تھے اور پانچ ہزار جوانوں جتنا اہم سمجھتے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بیڈفورڈ اور بستاروی وندوم کے درمیان سودا شروع ہوا۔ بالآخر جون آف آرک ایک بہت بڑی قیمت پر فروخت ہو کر انگریزوں کے ہاتھ آگئی۔ روون کے قلعے میں بھاری زنجیریں پہنا کر اسے قید کر دیا گیا۔ تقریباً ایک سال تک اٹھارہ انیس برس کی یہ لڑکی پابہ زنجیر رہی اس کے بعد مذہبی عدالت میں انگریزوں کے ایما پر اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کا کوئی وکیل نہیں تھا۔ کھیسٹون کے پادری، لاٹ پادری، بشپ، مفتی، علم دینیات کے بڑے بڑے ماہرین اور قانون دان جن کی تعداد پچانوے تک پہنچی ہے، اس کے منصف تھے۔

### مقدمے کا آغاز

بشپ: جون آف آرک، گاسپل پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ جو سوال تم سے کئے جائیں گے، تم ان کا صحیح جواب دو گی اور سچ بولو گی۔

جون آف کارک: مجھے حکم ہوا کہ میں قسم نہ کھاؤں

بشپ: تمہیں کس نے حکم دیا ہے؟

جون: خدا نے میرے کانوں میں آواز آئی ہے کہ میں قسم نہ کھاؤں اور پھر مجھے

یہ بھی تو معلوم نہیں کہ مجھ سے کیا کیا سوال کئے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے ایسی باتیں پوچھیں جن کا جواب دینا میں مناسب خیال نہ کروں۔

بشپ: تمہیں سچ بولنے کے لیے حلف اٹھانا ہوگا

جون: فرانس میں آ کر میں نے کیا کچھ کیا میرے ماں باپ کون تھے اگر آپ ایسی باتیں پوچھیں تو میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں لیکن خدا کی طرف سے مجھے کیا الہامات وصول ہونے اس کے بارے میں آپ کو سچی باتیں بتانے کے لیے میں کبھی حلف نہیں اٹھاؤں گی خواہ میری جان ہی چلی جائے۔

الہامات کے متعلق میں نے صرف اپنے بادشاہ چارلس سے بات چیت کی ہے اور کسی سے نہیں۔

بشپ: تمہاری عمر کیا ہے؟

جون: میرے خیال میں انیس برس کی

بشپ: تم نے دینی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

جون: اپنے ماں باپ سے

بشپ: دو سناؤ

جون: (ظن کے ساتھ) اس وقت سن لیجئے گا، جب میں اعتراف گناہ کروں

گی

بشپ: اعتراف گناہ کا موقع اب تمہیں نہیں ملے گا اس لیے کہ آئندہ تمہیں گرجا

گھر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

جون: کیوں؟

بشپ: اس لیے کہ تم بے دینی اور الحاد کے الزام میں گرفتار ہو  
جو: مجھے یہ پابندی منظور نہیں اور پھر میرے پاؤں میں یہ زنجیریں کیوں  
باندھی جاتی ہیں۔

بشپ: اس لیے کہ تم فرار نہ ہو سکو

روڈن کے قلعے میں جو آف آرک جس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہ تھی،  
قید تھی۔ اس کے پاؤں میں ہر وقت لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں رہتی تھیں تاکہ وہ  
بھاگ نہ سکے۔ پہرے پر تین انگریز فوجی افسر متعین تھے۔ مقدمے کی پہلی  
سماعت 22 فروری کو ہوئی تھی، دوسری سماعت دوسرے ہی روز ہوئی۔ ایک بار پھر  
اس سے گوسپل پر دونوں ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کو کہا گیا تو اس نے انکار کیا مگر بعد  
میں بدرجہ مجبوری اس نے یہ حلف اٹھا لیا سو اسات شروع ہوئے۔

جین: بچپن میں تمہارے کیا شغل تھے؟

جو: سینا پرونا اور چہ نہ کا نانا، زیادہ تر گھر میں رہتی تھی اور باہر کھیتوں میں  
بہت کم جاتی تھی۔

بشپ: سینا پرونا تم کیسا جانتی ہو؟

جو: شہر بھر میں ایسی کوئی عورت نہیں جو سینے پر ونے میں میرا مقابلہ کر سکے۔

جین: سب سے پہلی الہامی آواز تمہیں کب سنائی دی؟

جو: جب میں تیرہ برس کی تھی

جین: یہ آواز کس کی تھی؟

جو: خدا کی۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں پاک زندگی بسر

کروں۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے باپ کے باغ میں کھڑی تھی۔ جب مجھے یہ آواز سنائی دی، میں ڈر گئی۔

دینیات کا ماہر: یہ آواز تمہیں کس طرف سے سنائی دی تھی۔ دائیں طرف سے یا بائیں طرف سے؟

جون: دائیں طرف سے آواز سے پہلے مجھے روشنی دکھائی دی تھی  
دینیات کا ماہر: ہوں۔۔۔۔۔ تمہاری نجات کے لیے اس آواز نے تمہیں کیا ہدایات دی تھیں؟

جون: یہ آواز مجھ سے کہتی تھی کہ میں نیک اور پاک زندگی بسر کروں چرچ جایا کروں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فرانس جاؤں  
جین: شنون کے قلعے میں بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لیے بھی اسی آواز نے تمہیں حکم دیا تھا؟

جون: اسی آواز نے چونکہ بشارت ہوئی تھی اس لیے بادشاہ کو میں نے فوراً پہچان لیا

جین: بشارت کے وقت بھی کیا تمہیں روشنی نظر آئی تھی؟

جون: مجھے یاد نہیں

دینیات کا ماہر: بشارت میں جب تم نے اپنے بادشاہ کو دیکھا تو کیا اس کے سر پر کسی فرشتے کا سایہ تھا؟

جون: میں اس کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں

جین: یہ الہامی آوازیں کیا تم اکثر سنتی ہو؟



جون: ہر روز سنتی ہوں یہی آوازیں تو میری تسکین کا باعث ہیں

اسی طرح کے سوالات اس پر مقدمے کی تیسری سماعت میں کئے گئے۔ ایک وقت میں کئی آدمی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے مگر کہتے ہیں کہ وہ مطلق گھبراتی نہیں تھی۔ اس کو جادوگرنی، کافر اور ملحد ثابت کرنے کے لیے یہ عدالت بٹھانی گئی اس لیے ہر منصف کی یہی کوشش تھی کہ جون کے بیانات سے وہ تمام الزام ثابت ہو جائیں جو اس پر لگائے گئے تھے کہ یہ اس نے الہامی آوازوں کا ڈھونگ رچا کر کیسا اور مذہب کی بے حرمتی کی اور ہزار ہا انسانوں کا خون بہایا مقدمے کی تیسری سماعت میں باسٹھ اسیر تھے۔ چوتھی سماعت سے ایک روز پہلے وہ بیمار ہو گئی جس پر شاہ انگلستان کو سخت فکر لاحق ہوئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جون بیماری سے مر جائے وہ اس کی موت قانون کے ہاتھ سے چاہتا تھا چنانچہ جون کا علاج کیا گیا جب وہ تندرست ہو گئی تو پھر سوالات کا وہی سلسلہ شروع ہوا۔

بشپ: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتی ہو کہ پریاں بد ارواح ہیں؟

جون: مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں

بشپ: تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا سینٹ کیتھن اور سینٹ مارگریٹ کو

انگریزوں سے نفرت ہے؟

جون: ان کو صرف انہی چیزوں سے پیار ہے جو ہمارے رسول کو پیاری ہیں

اور وہ ان تمام چیزوں سے نفرت کرتے ہیں جن سے خدا نفرت کرتا ہے

جین: کیا خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے؟

جون: خدا انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا محبت، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم

نہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ سب انگریز فرانس سے باہر نکال دیئے جائیں گے سوائے ان کے جو یہاں مریں گے اور یہ کہ خدا فرانس کو فتح اور انگریزوں کو شکست دے گا۔

بشپ: کیا خدا اس وقت انگریزوں کے حق میں تھا جب وہ فرانس میں پھل پھول رہے تھے؟

جون: مجھے معلوم نہیں کہ خدا کس کے حق میں تھا لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی سزا دی۔

دینیات کا ماہر: اگر تم شادی شدہ ہوتیں تو کیا تمہیں الہامی آوازیں سنائی دیتیں؟

جون: میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی

ارڈ بشپ: جون! یہ سب لوگ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں، صاحب علم و فضل ہیں، دینیات کے ماہر ہیں ان سب پر فرض عائد ہے کہ وہ مال مہربانی اور شفقت سے کسی انتقامی جذبے کو اپنے دل میں جاہ دینے بغیر تمہیں گمراہی سے بچائیں اور نیکی کا صحیح راستہ بتائیں۔ چونکہ تم ان پڑھ ہو اور دینی علوم سے تمہیں زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لیے ہم تمہیں اپنے درمیان میں سے ایک وکیل دینے کے لیے تیار ہیں جس سے تم مشورہ لے سکو گی۔ اگر تم خود ہم میں سے کوئی آدمی اس کام کے لیے منتخب نہ کرو گی تو ہمیں یہ خود یہ انتخاب کرنا پڑے گا۔ بولو اس بارے میں تم کیا چاہتی ہو؟

جون: میں آپ کی اس عنایت کی شکر گزار ہوں آپ کے علاوہ ان سب کی بھی

ممنون و تشکر ہوں جو میرے سامنے بیٹھے ہیں لیکن مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں اس لیے کہ میں اپنے رسول کے مشوروں سے منہ موڑنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی الہامی آوازوں کو اس وکیل پر ترجیح دیتی ہوں۔

سارے مقدمے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ انصاف کرنے والے جو انصافی کرنے پر تلے ہوئے تھے ایک عرصے تک دیہات کی اس بہادر اور نڈر لڑکی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ جب اس کے بیانات ختم ہوئے تو اس کے خلاف بے شمار جرائم کی فہرست تیار کی گئی۔ اس کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس سے جھوٹے وعدے بھی کئے گئے کہ اگر وہ اعلانیہ طور پر خود کو تائب ظاہر کرے تو سزا میں رعایت کر دی جائے گی۔ آخر عورت ذات تھی ایک برس کی قید کی تکلیفوں ساٹھ ساٹھ ستر ستر آدمیوں کی جرح نے اور پاؤں کی زنجیروں نے اس بے چاری کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ موت سے کون خوف نہیں کھاتا اور پھر وہ موت جو آگ میں جل کر نصیب ہو، کتنی ہولناک ہے جو نے ڈر کے مارے منصفوں کے کہنے پر اپنے تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی اور اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس کو باقاعدہ نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے گی مگر شاہ انگلستان اس فیصلے سے کیسے مطمئن ہو سکتا تھا چنانچہ ایک چال چلی گئی۔ قید خانے سے عورتوں کا لباس ہٹایا گیا۔

بشپ: تم نے پھر مردوں کا لباس پہن لیا ہے؟

جون: میں نے اپنی مرضی سے پہنا ہے اس لیے کہ میرے خیال کے مطابق

اس وقت یہی لباس بہتر ہے۔

بشپ: تم نے اتنے آدمیوں کے سامنے قسم کھانی تھی کہ تم پھر کبھی یہ لباس نہ پہنو گی؟

جون: میرا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ یہ لباس ترک کرنے کی قسم کھاؤں

بشپ: سوال یہ ہے کہ تم نے مردوں کا لباس کیوں پہنا؟

جون: اس لیے پہنا ہے کہ اس وقت یہی موزوں و مناسب ہے اس لیے کہ

میں مردوں کے درمیان رہتی ہوں میں نے یہ لباس اس لیے پھر اختیار کیا ہے کہ مجھ سے جو وعدے کیے گئے تھے۔ پورے نہیں ہوئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ مجھے گرجے میں جانے کی اجازت دی جائے گی اور میرے پاؤں کی زنجیریں ہٹائی جائیں گی مگر کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

بشپ: تائب ہوتے وقت کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ یہ لباس ترک کر دو گی؟

جون: اگر آپ میری زنجیریں جدا کر دیں مجھے کسی اچھے قید خانے میں رکھیں او

ر میرے ساتھ کسی عورت کے رہنے کا انتظام کریں تو میں یہ لباس اتار دوں گی۔

بشپ: کیا تم نے تائب ہونے کے بعد بھی البامی آوازیں سنی ہیں؟

جون: سنی ہیں

بشپ: کیا کہا گیا ہے تم سے؟

جون: مجھ سے خدا نے سینٹ کیترائن کے ذریعے سے یہ کہلوایا ہے کہ میں

نے تائب ہونے میں سخت غلطی کی ہے۔ جان بچانے کے لیے میں نے اپنی

روح کو پستیوں میں گرا دیا ہے۔۔۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میں اس وقت ڈر گئی تھی



بشپ: ہمارا خیال ہے کہ دراصل ان کی کوئی حقیقت نہیں  
دوسرا پادری: تم غور کرو کہ یہ آوازیں تم سے کئی بار بہ چکی ہیں کہ اس مقدمے  
سے تم بری ہو جاؤ گی مگر تم بری نہیں ہوئیں۔

بشپ: ان آوازوں نے اس دوران میں تم سے کئی وعدے کئے ہیں سچ سچ کہو  
ان میں سے کوئی وعدہ پورا ہوا ہے؟

دوسرا پادری: یہ تمہارا وہم تھا۔  
بشپ: ممکن ہے بد ارواح نے تمہیں گمراہ کیا ہو۔  
دوسرا پادری: تمہیں غور کرنا چاہیے سوچنا چاہیے

جون: (گھبرا کر) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کے باعث آپ ہی  
ہوں گے۔

بشپ: جون! انجام جو کچھ بھی ہوگا تمہیں صبر کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا۔  
سزائے موت تمہیں صرف اس لیے ملے گی کہ تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی  
ہو۔

دوسرا پادری: جو کہ سب سے بڑا جرم ہے خدا اور کھیساکا  
بشپ: جون! اب سوچو کہ تمہاری آوازیں کدھر گئیں۔ ان سے تمہیں کیا فائدہ  
پہنچا ہے یہ تمہیں موت کے منہ سے بچا سکتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کبھی نہیں کیا ان  
آوازوں نے تمہیں صریحاً دھوکہ نہیں دیا؟

جون: اب ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے

بشپ: اب ظاہر نہیں، حقیقت میں ان آوازوں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ کیا اب

بھی تمہیں ان کی صحت پر یقین ہے؟

جون: مجھے اب سوائے خدا کے اور کسی پر یقین نہیں

بشپ: شاباش

دوسرا پادری: کیا ان آوازوں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا؟

جون: دیا ہے

دوسرا پادری: شاباش

انیس برس کی ناتواں لڑکی پر بالآخر اس کے منصفوں نے فتح پائی۔ چنانچہ جون دوسرے روز صبح نو بجے اس قید خانے سے نکالی گئی جہاں اس نے ایک سو اٹھتر دن جسمانی اور روحانی اذیتوں میں گزارے تھے۔ اس کو ایک چمکڑے میں بٹھایا گیا اور اسی ہتھیار بند فوجیوں کے پیرے میں وہ پرانی منڈی کے چوک میں لائی گئی جہاں تین بڑے بڑے مچان تیار کئے گئے تھے۔ ایک چبوتری پر پادری وغیرہ بیٹھے تھے جنہیں فیصلہ سنا تا تھا۔ دوسرے چبوترے پر جون کو کھڑا کر دیا گیا۔ تیسرے چبوترے پر جو چونے اور کچے کا بنا ہوا تھا۔ چوک کے عین درمیان تھا۔ اس پر ایندھن کا ایک انبار لگا تھا۔ چوک میں اتنے تماشاخانے جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کھوے سے کھوے چمکاتا تھا۔ بہت بڑے میلے کا سماں تھا۔ چھتوں پر کھڑکیوں میں ہر جگہ تماشاخیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ فیصلہ سنایا گیا۔

بشپ: ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ تم ایک گمراہ اور ملحد عورت ہو۔ اس خیال سے کہ تم دوسرے عیسائیوں کو گمراہی اور الحاد کا راستہ نہ دکھاؤ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تہذیب کے رشتے سے منقطع کر دیا جائے اور تمہیں عام انسانی عدالت کے حوالے کر





ہو۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بھی فرانس سے محبت ہے۔۔۔۔۔ تم کہو تو میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ مجھے فرانس سے محبت نہیں تھی، میں نے اس سے غداری کی۔۔۔۔۔ میں یہ سب کچھ ماننے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میں سب سے معافی مانگی ہوں، انگریزوں سے جنہیں میں اپنے وطن کا دشمن سمجھتی رہی ہوں۔۔۔۔۔ ان سپاہیوں سے جو میرے جھنڈے تلے ان انگریزوں سے لڑتے رہے ہیں۔ میں سب سے گڑگڑا کر معافی مانگتی ہوں۔۔۔۔۔ پادریوں، منشیوں اور دینیات کے ماہروں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ میری نجات کے لیے دعا مانگیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک جون آنکھوں میں آنسو لے کر اس طرح گڑگڑا کر تماشا نیوں سے معافی مانگی رہی لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس دوسرے چبوترے پر کھڑا کر کے اردگرد ایندھن کی لکڑیاں چن دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے انگریز سے جو اس کے پاس ہی چبوترے پر کھڑا تھا صلیب مانگی اس انگریز نے دو تنکے جوڑ کر صلیب بنائی اور جون کو دے دی۔ جون نے یہ صلیب اپنے سینے کے ساتھ لگا لی۔ ایندھن کو آگ دکھائی گئی۔ خشک لکڑیاں چیخ چیخ کر اس ظلم کی فریاد کرنے لگیں۔ گاڑھے دھوئیں نے کنواری جون کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ چہ مرتبہ اس نے ”یسوع مسیح“ کہا۔۔۔۔۔ اس کے بعد کوئی آواز اس کی چتا سے نہ آئی۔۔۔۔۔!

## انصاف

دروازہ کھلتا ہے۔ چوہدار تین مرتبہ فرش پر اپنی انٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوہدار: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، شہنشاہ عالم لٹچ کے لیے تشریف لارہے ہیں۔

شہنشاہ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تشریف لاتے ہیں۔ شہنشاہ: ہیڈ بلکر کہاں ہے؟

چوہدار ایک بہت بڑی ڈش سے سرپوش اٹھاتا ہے۔ ہیڈ بلکر پھدک کر باہر نکلتا ہے اور عرشِ سام کرتا ہے۔

ہیڈ بلکر: غلام سیلوٹ بجالاتا ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: دسترخوان پر آج مابدولت کے لیے کیا کیا چیز حاضر ہے؟

ہیڈ بلکر: گوشت پلاؤ، ماسی پلاؤ، مٹر پلاؤ، نارنگی پلاؤ، تنجن، بریانی، زردہ، روغن جوش، قورمہ، ٹماٹر گوشت، بھنڈی گوشت، مٹر گوشت، پائے کا شوربہ، قیمہ بھیجا، چکن کٹلس، چکن چائپس، مٹن چائپس، پوٹو چائپس اور خدا جہاں پناہ کا بھلا کرے ارہر کی وال

شہنشاہ: (غصے میں) ارہر کی وال، مابدولت کو بالکل پسند نہیں

ہیڈ بلکر: یور میجسٹی، آج لٹچ پرتین اشتراکی والایتوں کے وزیر اعظم مدعو ہیں اس

لے۔۔۔۔

شہنشاہ: (خوش ہو کر) مابدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہو کر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ بلر: میری سانس رک جائے گی عالم پناہ

شہنشاہ: (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو اچھا مابدولت تمہیں سر کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔

ہیڈ بلر: جہاں پناہ کی اس قدر افزائی نے ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ: اور کس صفائی سے بینک لگی نہ پھٹکوی

ہیڈ بلر: غلام سیلوٹ بجالاتا ہے، یور میجسٹری

دروازہ کھلتا ہے چوہدرتین مرتبہ فرش پر اپنی لائٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور

اعلان کرتا ہے۔

چوہدرتین: باادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، باادب، با ملاحظہ، ہوشیار،

نظریں رو برو ملکہ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے ملکہ عالیہ کی سواری آتی

ہے۔

ملکہ: جہاں پناہ کو زیادہ دیر تو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں اپنی خادماؤں کے سر

میں جوئیں ڈلواری تھی۔

شہنشاہ: کیوں؟

ملکہ: رعایا کے لیے میں ایک بلڈ بینک کھولنے کا ارادہ رکھتی ہوں

شہنشاہ: امور سلطنت سے تمہاری یہ دلچسپی مابدولت کے لیے باعث مسرت

ہوتی۔۔۔۔۔!

ہیڈ بلر: رعنا یا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص  
ملکہ اس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ: پہلے یونہی مشہور تھا کہ فلانا بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک  
گھاٹ پر پانی پیتے تھے لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر  
اور بکری اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حادثہ امکان میں لانے کے لیے مابدولت کو  
تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ بلر: اس میں کیا شک ہے

گھٹی کی آواز بلند ہوتی ہے

شہنشاہ: (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بلایا یہ کون فریادی ہے جس نے عدل و  
انصاف کی آہنی زنجیر کو جنش دی؟

ملکہ: جہاں پناہ! کیا اسی وقت تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ: اسی وقت، اسی گھڑی، جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سن لیں  
گے ارہر کی دال ہم پر حرام ہے۔ ہم ابھی جھرو کے میں جا کر فریادی سے ملاقات  
کریں گے، ضرور کسی انسان پر ظلم ہوا ہے۔

چو بد ارتین مرتبہ فرش پر اپنی آنکھیں سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چو بد ارت: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، نظریں رو برو، با ادب، با ملاحظہ ہوشیار،

نظریں رو برو، شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لیے تشریف لارہے ہیں۔

شہنشاہ، ملکہ اور ہیڈ بلر تینوں باہر جھرو کے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شہنشاہ: یہ کون تھا جو نے ہمارے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر ہلانی اور ہمارا انصاف چاہا۔

فریادی: یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ  
شہنشاہ: تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا فریادی دودھ کا دودھ اور پانی کا  
پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

فریادی: عالم پناہ آج کل کے ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے  
ہوتے ہیں باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شہنشاہ: مہمن رہو فریادی دودھ کے یہ دو قطرے ہی تلخہ کر کے دکھا دینے  
جائیں گے۔ بولو، بے خوف و خطر ہو کر بولو کہ تمہیں کس نے دکھ پہنچایا ہے کیا ملکہ  
عالم کے پستول سے تمہاری بیوی۔۔۔۔۔؟

فریادی: نہیں عالی جاہ! ملکہ عالم کے پستول سے میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔  
شہنشاہ: تاریخ نے خود کو نہیں دہرایا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے بولو، تم  
کام کیا کرتے ہو؟

فریادی: عالم پناہ کے سائے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی انڈری کھول  
رکھی ہے۔

شہنشاہ: کپڑے گھاٹ پر تم خود دھوتے ہو؟  
فریادی: نہیں عالم پناہ! یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے پیر ذکر رکھا ہے۔

شہنشاہ: ایسا ہی ہونا چاہیے اب بتاؤ تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟  
فریادی: جہاں پناہ! مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو

میں بیان کر سکوں۔

شہنشاہ: (جموڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد) فریادی! تم کوئی فکر نہ کرو۔ ہم الفاظ کا بندوبست کئے دیتے ہیں ہیڈ: بٹلر؟

ہیڈ: بٹلر: غلام حاضر ہے جہاں پناہ

شہنشاہ: جموڑی اسی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا ہیڈ: بٹلر: غلام اس قدر انزانی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شہنشاہ: اب خود کو اس قدر انزانی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمہیں وزیر الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

ہیڈ: بٹلر: غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

شہنشاہ: تم مسمن ہو فریادی؟

فریادی: میں بالکل مسمن ہوں غلام پناہ

شہنشاہ: وزیر الفاظ جاؤ، فریادی کی فریاد ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ: بٹلر: کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لیے درخواست

کرتا ہے

شہنشاہ: مابدولت دو ماہ کی مہلت عطا کرتے ہیں

ہیڈ: بٹلر: شکریہ!

فریادی: شکریہ!







شہنشاہ: (فکر مند ہو کر) والا شان شہزادیوں نے بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟  
ہیڈ بلر: ایسا ہی ہوا جہاں پناہ۔۔۔ شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سو  
دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ ہے جو والا شان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے  
کے لیے عالم پناہ کے احکام کے مطابق ہر نختے فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ: دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ہیڈ بلر: عالم پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین  
چنانچہ فریادی کو ان کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

فریادی: فریادی کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اس نے تگ آ کر ان کو  
اس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں والا شان شہزادیاں نشانہ درست  
کریں۔۔۔ لیکن افسوس ناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر  
ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع  
بم پہنچا دیا ہے۔

شہنشاہ: غور کرنے کے بعد مابودلت بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں تاریخ میں اس  
سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقع سے دو چار ہونا پڑا تھا لیکن ہم عہد جدید کے شہنشاہ  
ہیں۔۔۔۔۔ جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا خون کا بدلہ صرف  
خون ہے۔

ہیڈ بلر: کیا والا شان شہزادیاں خاتم بدہن۔۔۔

شہنشاہ: وزیر الفاظ! تمہیں اپنا فرض ادا کرنے دو

چو بدارتین مرتبہ فرش پر اپنی لائٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے



فریادی: جہاں پناہ! ان ساڑھے سات سو دہائیوں میں خون کا صرف ایک قطرہ تھا

شہنشاہ: تمہیں کیسے معلوم ہے؟

فریادی: سارا خون نچوڑ کر میں نے صرف ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا کہ ان میں زندگی کی رمتی باقی رہے۔

شہنشاہ: مابدولت کی نگاہ عدل میں خون کے ایک قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ راجت پسند قوتیں ہمیں گمراہ کرنے پائیں مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم انڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں اپنی مثالی غیر جانب داری سے کام لینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے۔۔۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ والا شان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے لیکن اسے دہائیوں کے سرخ خون کا بدلہ دینا ہوگا۔۔۔۔۔ ہر چہارا کناف اعلان کر دیا جائے کہ مابدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ ملر: کمیشن؟

ملک: کمیشن؟؟

فریادی: کمیشن؟؟؟

شہنشاہ: ہاں کمیشن یہ کمیشن ملک کے دو سب سے بڑے دہائیوں، دو سب سے بڑے ڈرائی کمیٹیوں اور چھ سب سے بڑے خطاب یافتہ سرکاری منصفوں پر





منشی شو نرائن تم طرز تحریر پر بھی غور نہیں کرتے  
منشی شو نرائن: (کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) مجھے افسوس  
ہے (مرزا غالب کا نوکر کا داخل ہوتا ہے)  
کلو: حضور منشی غلام رسول صاحب آئے ہیں  
غالب: تشریف لائیں  
(کلو کمرے سے باہر جاتا ہے اور منشی غلام رسول داخل ہوتے ہیں)  
غلام رسول: بتسلیم بجا لاتا ہوں مرزا صاحب  
غالب: بتسلیم، کہئے کیوں کر آنا ہوا منشی صاحب  
غلام رسول: مسٹر ناسن صاحب سیکرٹری بیمار نے آپ کی خدمت میں سلام  
عرض کیا ہے ان کا خیال ہے کہ جناب کو کالج میں فارسی کا استاد مقرر کریں  
منشی شو نرائن: مبارک ہو مرزا صاحب  
غالب: بھئی پوری بات تو سن لو۔۔۔۔۔ ہاں تو اور کیا منشی صاحب؟  
غلام رسول: انہوں نے کل دس بجے آپ کو بلایا ہے  
غالب: بہتر، میری طرف سے بہت بہت سلام عرض کیجئے گا اور کہئے گا کہ  
زہے نصیب آپ نے مجھے منتخب فرمایا ہے۔۔۔۔۔ میرا شکریہ قبول ہو۔  
غلام رسول: تو میں سیکرٹری صاحب بیمار کی کوٹھی کے بائیں باغ میں حاضر  
رہوں گا اور جو نبی آپ تشریف لائیں گا فوراً آپ کی تشریف آوری کی خبر کر دوں  
گا۔

غالب: آپ کی نواش ہے، میں وقت پر حاضر ہو جاؤں گا

غلام رسول: اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں

(منشی غلام رسول کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں)

منشی شو نرائن: (مسکراتے ہوئے) اب تو اجازت ہے مبارک باد دینے کی

نائب: (مسکرا کر اٹھتے ہوئے) نہیں سب سے پہلے مجھے اپنی بیگم کی مبارک

باد لینے دو۔

مرزا غالب زمان خانے میں خوش خوش داخل ہوتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ

امراؤ بیگم بیٹھی وضو کر رہی ہیں انہیں دیکھتے ہی انہوں نے منہ سجایا اور کہنا شروع کیا۔

امراؤ بیگم: آج دو روز سے کہہ رہی ہوں کہ ایک وقت میرے پاس بیٹھ کر

ٹھنڈے دل سے میری چند باتیں سن لیجئے پر آپ کو فرصت کہاں

نائب: (پاس ہی چوکی پر بیٹھ کر) بیگم صلاب! مجھے معلوم ہے کہ آپ مہین مہین

چنگلیاں لے کر نصیحتیں یا شخصیتیں کیجئے گا۔ خیر فرمائیے۔

امراؤ بیگم: (چہرہ کر) دیکھئے پھر آپ نے طعن طرہ کی باتیں شروع کر دیں۔

نائب: (زیر لب مسکراتے ہوئے) اچھا جو آپ کہنا چاہتی ہیں کہنے

امراؤ بیگم: میں کہتی ہوں کہ کب تک گھر کا اساسہ بیچ کر گزران ہوگی۔ کس

طرح یہ نیل منڈھے چڑھے گی۔ قرض کس صورت سے ادا ہوگا۔ اے قرض جانے

جنم میں روزمرہ کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے اب تو لتے بدن پر

جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

نائب: (پراسرار طریقے پر مسکراتے ہوئے) آپ گھبرائیے مت خدا نے سن

لی ہے (چوکی پر سے اٹھو کر کھڑے ہوتے ہیں)

امراؤ بیگم: کیا سن لی ہے خدا نے؟

نالب: (فاتحانہ انداز میں) آپ کے وظیفوں کی برکت سے مسٹر ناسن بہادر نے مجھے بلایا ہے کالج میں فارسی زبان کا استاد مقرر کرنا چاہا ہے اور یقینی طور پر میری ہی اک ایسی ذات ہے جو اس عہدے کے لائق ہے۔

امراؤ بیگم: اپنے منہ میاں مٹھو

نالب: جی سن تو لیجئے کم سے کم سے کچھ نہیں تو سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہو اتو میرا مقرر ہو ہی جائے گا لے اب خوش ہوئیں

امراؤ بیگم: (اونالے کر اٹھتے ہوئے) ہو گئی

نالب: تو ذرا ہنس لیجئے

امراؤ بیگم: چو چلے نہ بگھاریئے

نالب: (خوش قلبی سے) نہیں میری جان کی قسم ہنسوتا کہ ذرا مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو۔

امراؤ بیگم: (کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے)

نالب: (اطمینان کے ساتھ) خدا میری بیگم کو بنتا ہی رکھے، بھئی امراؤ بیگم تم نالب کی روح ورواں ہو۔

امراؤ بیگم: اب اپنی شاعری رتبے دیجئے اور صاحب سکتر بہادر کے ہاں جانے کی تیاری کیجئے۔

دوسرے روز صبح کو مرزا نالب مسٹر ناسن سے ملاقات کرنے کے لیے تیار



ہونے لگے۔

نائب: (منظرب حالت میں) کیوں میاں مداری یہ کلو دارو نہ کہاں گئے؟  
مداری: جی انہی تو یہ ہیں تھے حضور شاید معظم علی عطرفروش کی دکان پر بیٹھے ہوں  
گے

نائب: ذرا باہر مجھے سکتر بہادر کے ہاں جانا ہے مرے درباری کپڑے نکال  
دیں۔

مداری: (قدموں کی چاپ سن کر) لیجئے کلو دارو نہ آگئے۔  
(کلو داخل ہوتا ہے)

کلو: آپ نے مجھے یا بفرمایا

نائب: بھئی کلو تم کہاں دن بھر نائب رہتے ہو؟

کلو: کیا حکم ہے سرکار؟

نائب: ذرا میرے درباری کپڑے نکالو، مجھے آج دس بجے سیکرٹری صاحب  
بہادر کے ہاں جانا ہے۔

کلو: (جا کر پلٹتے ہوئے) کیوں سرکار وہ شمالی چوند اور دستار ضرور نکالی جائے  
گی جوڑا کون سا نکالا جائے گا؟

نائب: وہ ناندے کی جامدانی کا انگر کھایا وہ ریشمی دھاری اور قلم کار اور جو تاجی  
سلیم شاہی جو آج آٹھ روز ہوئے میں نے خریدا ہے۔۔۔ ہاں ادراک شمالی  
رو مال بھی نکال لینا۔

درباری کپڑے پہن کر مرزا نائب تیار ہوئے اور ہوادار میں سیکرٹری صاحب

بہادر کی کوشمی پر پہنچے۔ منشی غلام رسول پائیں باغ میں پونے دس بجے سے ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ جونہی کباروں نے ہوا دار کندھوں سے اتارا، منشی غلام رسول مسٹر نامسن بہادر کو خبر دینے کے لیے کوشمی کے اندر داخل ہوئے۔

غلام رسول: سرکار مرزا غالب سلام عرض کرتے ہیں اور فرماتے ہیں حسب احکام میں حاضر ہوں۔

نامسن: (گھڑی دیکھتے ہوئے) بہت پابندی وقت سے تشریف لائے اچھا سلام دو اور کہو تشریف لائیں۔

منشی غلام رسول باہر آئے غالب چہل قدمی کر رہے تھے۔

غلام رسول: حضور تشریف لے چلنے صاحب بہادر یا فرماتے ہیں

غالب: (حیرت سے) کیا کہا؟

غلام رسول: آپ کو بلایا ہے حضور

غالب: بلایا ہے؟ دستور کے موافق صاحب سکتے بہادر مجھ تا چیز کو لینے آئیں تو

میں چلا چلوں گا۔

غلام رسول: بہتر میں جا کر عرض کرتا ہوں

منشی غلام رسول ایک بار پھر اندر آگئے اور مسٹر نامسن سے کہا

غلام رسول: حضور وہ فرماتے ہیں کہ حسب دستور میرے لینے کو آئیں تو میں

چلوں

نامسن: (مسکرا کر) بڑے بگڑے دل و دماغ دار معلوم ہوتے ہیں چلو میں خود

ان سے بات کرتا ہوں۔

مسٹر نامسن کوٹھی سے باہر نکلے اور مرزا غالب سے مصافحہ کیا۔

نامسن: تسلیم عرض کرتا ہوں مرزا صاحب

غالب: کورس بجا لاتا ہوں

نامسن: آپ اندر تشریف کیوں نہیں لائے۔

غالب: دوستوں کے موافق آپ مجھنا چیز کو لینے آتے، میں حاضر ہوتا۔

نامسن: (مسکرا کر) مرزا صاحب جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں

گئے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے

آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔

غالب: قبلہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ کر کے حاضر ہوا ہوں اور یہ امید تھی

کہ اس ملازمت سے کچھ عزت زیادہ ہو جائے، نہ اس لیے کہ رہی تھی ہی عزت میں

فرق آئے۔

نامسن: میں قاعدے سے مجبور ہوں

غالب: (ہوادار کی طرف جاتے ہوئے) تو مجھے اس خدمت سے معاف رکھا

جائے تسلیم عرض ہے

نامسن: تشریف لے جائیے گا۔۔۔۔۔؟

غالب: ہوادار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کباروں کو حکم دیتے ہیں کہ واپس گھر چلو،

واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں گھر کے باہر اپاجوں اور بھکاریوں کا جھوم جمع ہے اور

بی زمین ان میں خیرات بانٹ رہی ہے۔ مرزا صاحب کو سخت حیرت ہوئی۔ جلدی

جلدی اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو دیکھا کہ تخت پر امرائے نیگم دو گانا ادا

کرنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے سلام پھیرتے ہی مرزا صاحب کو مخاطب کیا۔

امراؤ بیگم: الحمد للہ! کہنے خدا کا فضل ہو گیا

نائب: (نائب تخت پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں، ہو گیا

امراؤ بیگم: کیا مطلب؟

نائب: مطلب یہ کہ رہی۔ ہی عزت مٹن میں ملنے سے بچ گئی

امراؤ بیگم: ہائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ

نائب: (اٹھ کر تمنا کے ساتھ) بیگم! عزت و ناموش کے لیے ہم نفل بچے

مر مٹنے والے ہیں۔ میں وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ ملازمت سرکاری سے کچھ

اس عزت میں اضافہ ہو جائے گا مگر وہاں صاحب سکتر بہادر میرے استقبال کو باہر

نہ آئے۔ بھلا سوچو مجھے یہ بے عزتی کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں ہیں کہ ہم

اٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہو

لیکن میں پوچھتا ہوں یہ باہر خیرات کیسی بٹ رہی ہے۔

امراؤ بیگم: (فکر مند ہو کر) کچھ نہیں

نائب: کچھ نہیں کیا تم تو ابھی کل ہی کہہ رہی تھیں کب تک گھر کا اساسہ تیج کر

گزران ہوگی۔

امراؤ بیگم: (مسکرا دیتی ہے)

نائب: ارے بھئی کچھ تو بتاؤ؟

امراؤ نیگم: کیا بتاؤں۔۔۔؟ کمل میں نے اپنا جڑاؤ گلو بند بی رمین سے گراؤ  
رکھوا کر کچھ روپے منگوائے تھے۔ شہر میں آپ کی ملازمت کا چرچا سن کر در پر یہ  
بھکاری جمع ہو گئے تو میں نے بی رمین سے کہا ”جاؤ ان کا سر صدقہ دے آؤ“  
غالب کھلکھا کر ہنس پڑتے ہیں امراؤ نیگم گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

## آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی

کشمیرن والے کٹڑے میں ایک چھت پر مرزا اسد اللہ خان (غالب) اور اس سے کچھ دور دوسری چھت پر کنور بلوان سنگھ پتنگ بازی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

اسد اللہ خان ہوا کا رخ دیکھتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف سے کہتا ہے ”یوسف ذرا وہ مال ہم دھڑ بڑھانا اس مانگ پائی پتنگ کی چات پھرت اچھی رہے گی۔ مرزا چھپا کے ہاتھ کے کانپ ٹھڈے چھلے ہوئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے پتنگ کو ماہرانہ انداز سے دیکھا ”بڑا ہی زور دار پتنگ ہے“ اور ہنسی دھڑ سے مخاطب ہو کے کہا ”وہ دو بیٹے نخ والی چرخنی جو چھوٹی تپائی پر دھڑی ہے لے لو اور اس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔“

ہنسی دھڑ نے پتنگ لیا اور مرزا یوسف نے چرخنی اٹھا کر کہا ”لیکن بھائی جان! اس نخ کا مانجھا تو بہت کھردرا ہے“ اور ڈور پر ہاتھ پھیرنے لگا ”یہ تو ڈھیل پر اڑانے کی نخ ہے۔“

اسد اللہ نے ذرا بھنا کر کہا ”بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں میں نے خود اسی خیال سے مانجھا کھردرا رکھوایا ہے۔“

مرزا یوسف بڑے بھائی کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

ادھر دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ سے اس کا دوست شمشیر سنگھ کہہ رہا تھا

کنے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجئے گا“

بلوان سنگھ نے آسمان میں اڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔  
تمہیں باندھ لو لیکن دیکھو دوہرے کنے ہوں پھر شمشیر سنگھ کی طرف دیکھ کر تا کیدا  
کہا ”اور سنا تم نے اوپر سات اور نیچے پانچ گھر ہیں لگانا۔ ہوا ذرا تیز ہے اور پتنگ  
بھی زور دار ہے۔“

شمشیر نے ایسا ہی کیا اور پتنگ بڑھا کر کنور بلوان سنگھ سے کہا ”بلوان سنگھ میں  
تو کھینچ کے پیچ لڑاؤں گا تو سہی۔ اس دو باز سے مرزا نوشہ کی جی بلوا دوں“  
کنور مسکرایا اور اپنی نامعلوم موچھوں کو تادے کر اسد اللہ خان کی طرف  
دیکھا۔ جو اپنا پتنگ بڑھانے میں مشغول تھا اور چلا کر کہا ”کیوں مرزا نوشہ اس  
مانگ پائی پتنگ سے تو مرزا چھپا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے اور سجاوٹ بھی  
انہی کے ہاتھ کی ہے خوب اڑائے لے رہا ہے۔“

ادھر سے اسد اللہ نے کہا ”تو اور کیا؟“

ادھر سے کنور بلوان سنگھ چلایا ”مگر بھی سنا مرزا نوشہ میں کھینچ گھسیٹ کے پیچ  
نہیں لڑاؤں گا۔ تم ٹھہرے سپاہی مار دھاڑ کی سو جہتی ہے میں تو ڈھیل کے پیچ  
لڑاؤں گا۔ کم از کم پھینٹی دو۔ پھینٹی نخ پر ہو تو وہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔“

اسد اللہ نے پتنگ کو خوب ڈور پائی اور بلوان سنگھ کو جواب دیا ”کنور صاحب  
آپ دو نہیں، تین پھینٹی پر پتنگ ملائیے۔ آج اس پتنگ سے نو پیچ کاٹوں گا۔ نو  
شیر و ابنا کے چھوڑوں گا۔“

یہ سن کر ہنسی دھڑرا آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہا ”کنور صاحب سنتے ہیں نو

تیج تو مرزا نوشہ آپ کے سر چڑھائیں گے اور دتھواں گیا رتھواں میرے آپ کے  
تیج لڑے گا۔ میں اس دو باز سے آپ کا پیٹا کاٹوں گا اور ایک کے کنوں گا۔“  
بلوان سنگھ ہنسا ’’الہ تمہارے تو چھیا رندی کنے لے گی تم مجھ سے کیا تیج لڑا سکتے  
ہو اچھا رہی تم سے بھی آخر کے دو تیج لڑیں گے۔“

ششیر سنگھ چلایا ’’ہنسی دھتر تمہارے دو باز کو تو بڑھاتے ہی ہاتھ پر کاٹوں گا تو  
ہی قلابازی کھاتا ہوا قلعے تک جائے وہاں کے تلنگے تمہارا ڈور لوٹیں اور تمہارا گن  
گائیں“

اس پر دونوں دوستوں نے خوب تھقبے لگائے ادھر اسد اللہ خاں نے جس کی  
آنکھیں اپنے دو باز پر جمی تھیں ہنسی دھتر سے جو پتنگ بڑھا رہا تھا کہا ’’ہنسی دھتر ہوا  
کار خبر معلوم ہوتا ہے پتنگ ایک ہی لپیٹی پر بندول جانے لگا اچھا ماماؤ۔“  
تموڑی دیر کے بعد تیج مل جاتے ہیں لیکن بلوان سنگھ نے ذرا پتنگ روک کر  
ایک ایسا آڑا ہاتھ مارا کہ اسد اللہ خاں کٹ جاتا ہے۔ اس پر بلوان سنگھ اور اس کے  
ساتھی ایک شور برپا کر دیتے ہیں ’’وہ کاٹا، وہ کاٹا، وہ کاٹا مرزا نوشہ کٹ گئے“

اسد اللہ خاں بگڑ جاتا ہے اور سارا نزلہ یوسف اور ہنسی دھتر پر گرتا ہے۔ ہنسی  
دھتر تمہاری جو بات ہے، بے عقلی سے خالی نہیں، گندھے نہیں گدھتوں کے سردار ہو تم  
نے بہت ہی کھر دراما نچھا رکھوایا اور نہ یہ تیج کٹنے والا تھا پھر مرزا یوسف پر بگڑنا  
شروع کیا ’’یوسف تم نے بھی مجھ پر زور نہ دیا کہ بھائی جان اس نخ پر پتنگ نہ  
بڑھائے“

مرزا یوسف نے آہستہ سے جواب دیا ’’بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ



مانجھا بہت کھر دراہے اور اس پر ڈھیل ہی کے پیچ لڑیں گے۔ اصل میں بلوان سنگھ نے دتو کا دیا پہلے کہا پیچ پھیسٹی دو پھیسٹی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پینا کاٹ لیا۔“

ہنسی دھرنے چرخی تپانی پر رکھی اور کہا ”چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں، مگر اسد اللہ جسے شکست نے جھنجھلا دیا تھا اور بگڑ گیا ”تم دونوں پینگ بازی سے نا واقف ہی فقط نہیں بلکہ زے کھرے بیوقوف ہوا لو کی دم ناختہ“

ہنسی دھرنے غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ”خیر اب جو ہونا تھا ہو گیا آپ نے سینکڑوں پیچ کاٹے ہیں آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ لیا تو کیا ہوا۔“

بہت دیر کے بعد مرزا اسد اللہ خان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آخر میں یہ طے ہوا کہ چوسر کی ایک بازی رہے چنانچہ تینوں کوٹھوں سے اترے اور گھر کا رخ کیا۔

مرزا اسد اللہ خان کے مانا خولجہ غلام حسین خان زمان خانے سے باہر نکل رہے تھے کہ چلن اٹھی اور امراؤ بیگم کی آواز آئی مانا جان آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔

خولجہ غلام حسین نے اپنے قدم روک لئے اور پوچھا ”کیوں امراؤ بیگم خیر تو ہے“

امراؤ بیگم نے دروازے کی آڑ میں شرماتے ہوئے کہا ”مانا جان! آپ خان کو منع بھی نہیں کرتے۔“

”کسے پینا؟“

امراؤ بیگم اور زیادہ شرمائی ”خان ہی کو“

خولجہ صاحب سمجھ گئے ”میں سمجھا مرزا نوشہ کو“

”جی ہاں! آپ ان کو منع ہی نہیں کرتے، دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں

اور۔۔۔ اور شام کو روزانہ کنور بلوان سنگھ سے پتنگ بازی ہوتی ہے۔“

خولجہ صاحب نے سرد آہ بھری ”میں جانتا ہوں“

امراؤ بیگم نے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا ”پیسہ اڑ رہا ہے اور ان کے

مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی

اس بات کو ان پر جتاؤں۔“

خولجہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”ہاں بیٹی! میں بھی کئی دن سے

سوچ رہا تھا کہ اس کو مناسب طور پر سمجھائیں سو آج تم نے مجھے یاد دلایا۔ میں

ضرور رکبوں گا تم خاطر جمع رکھو۔“

امراؤ بیگم کو کچھ تسلی ہوئی ”حسنو! آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا

خزانہ بھی ہو تو خالی ہو جائے۔ ذرا نہیں سمجھتے کہ آج۔۔۔۔۔“ شرما جاتی ہے ہم دو

ہیں کل تین ہو جائیں۔ اپنے فضل و کرم سے کوئی نیا بندہ اللہ بھیج دے تو اس کی

پرورش تعلیم تبھی تو ہے۔

خولجہ صاحب مسکرائے ”خدا تیری زبان مبارک کرے“

”جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ان کو نصیحت کیجئے اگر سنیں گے تو وہ

آپ ہی کی سنیں مجھے تو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتے۔“

خولجہ صاحب نے ڈیوڑھی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ”اچھا بیٹی! لو میں

آج ہی کہتا ہوں۔“

خولجہ صاحب جو نئی ڈیوڑھی میں پہنچے۔ ان کی اسد اللہ منسی دھڑ اور مرزا یوسف سے مڈ بھیسٹر ہو گئی جو کشمیرن والے کتڑے سے آرہے تھے۔ خولجہ صاحب نے اسد اللہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”صاحب زادے! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، ذرا ادھر آؤ“ پھر یوسف اور منسی دھڑ سے کہا ”آپ دیوان خانے میں چل کر بیٹھئے یہ تموڑھی دیر میں آتے ہیں۔“

منسی دھڑ اور مرزا یوسف چلے جاتے ہیں خولجہ صاحب وہیں ڈیوڑھی میں اسد اللہ خان سے مخاطب ہوتے ہیں۔ مرزا نوشہ میرے اس سوال کا جواب دو مجھے اپنا یہی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ؟

اسد اللہ سٹٹا گیا ”انا جان! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں آپ نے مجھے پالا ہے، پرورش کیا ہے۔ آپ میرے یہی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں۔“

خولجہ صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے ”مرزا نوشہ! اب تمہاری عمر ماشاء اللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہے لیکن تمہارا شغل اب سوائے دن بھر چوسر کھیلنے اور شام کو پتنگ اڑانے کے اور کچھ نہیں رہا۔ دولت برباد کر رہے ہو۔ بھائی! ہوش میں آؤ، کوئی مال حاصل کرو۔ نام و نمود پیدا کرو۔ اپنے بڑوں کی جائیداد میں اضافہ کرو“

خولجہ صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرزا اسد اللہ کے استاد مولوی عبدالصمد پارسا ایرانی آتے دکھائی دینے۔ مرزا اسد اللہ بڑھ کر کورس بجالایا ”السلام علیکم“

ملا عبدالصمد صاحب نے شفقت کے ساتھ جواب دیا ”زندہ باش“ خولجہ صاحب سے کہا ”مزاج مبارک“

خولجہ صاحب بھی مسکرائے ”الحمد للہ! ہر حال میں اللہ کا شکر ہے آپ خوب وقت پر آئے۔ میں آپ کے سنا کر دیکھ کر کچھ نصیحت کر رہا تھا۔“

ملا صاحب ایک بار پھر اسد اللہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے خولجہ صاحب نے کہنا شروع کیا ”میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی اب تم سولہ سترہ برس کے ہو گئے ہو ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو، ذرا ابو واجب کھیل کود سے ہاتھ اٹھاؤ۔ کچھ دنیا میں نام پیدا کرو کوئی مال حاصل کرو“

ملا عبدالصمد صاحب نے جنہیں غالباً اسد اللہ خان نے کوئی اشارہ کیا تھا اس سے کہا ”جاؤ بابا جاؤ میں خولجہ صاحب سے باتیں کر کے ابھی تمہارے پاس آتا ہوں“

اسد اللہ خان نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد ملا صاحب خولجہ غلام حسین خاں سے مخاطب ہوئے ”جناب خولجہ صاحب! برانہ ماننے تو ایک بات عرض کروں“

خولجہ صاحب نے فوراً ہی کہا ”نہیں برامانے کی کیا بات ہے آپ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟“

ملا صاحب کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پیدا ہوئی ”مرزا نوشہ! آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا خان سے بھی زیادہ عہدہ ہزاری پر پہنچ کر سپہ سالار بھی ہو گیا تو کیا ایسوں کے نام ان کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں مگر اسے تو ادب اور شعر کا انفراسیاب بنانا ہے۔“

خولجہ غلام حسین کچھ چکرا سے گئے۔ ”آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا،

آپ کا مطلب کیا ہے؟“

ملا صاحب نے اپنا مطلب واضح کیا ”اسد اللہ خان بہت بڑا شاعر ہوگا اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ کا اور ہمارا نام اسی کی بدولت روشن ہوگا سو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے“

نوابہ صاحب نے ملا عبد الصمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ”ملا صاحب! میں تو حباب برآب ہوں اور آپ اپنے وطن ایران جا رہے ہیں باقی اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ مرزا نوشہ فن شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یونہی ہی خدا ایسا ہی کرے آپ کے منہ میں کھی اور شکر“

دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان خانے میں چلے گئے۔ ادھر بنسی دھڑکے مکان میں چوسر پہنچی ہوئی ہے اور اسد اللہ خان بری طرح اس کھیل میں محو ہے، بنسی دھڑنے پانسہ پھینکا اور اسد اللہ خان سے کہا ”رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بد رنگ میں یہ جو دو گولٹیں آپ کی باقی ہیں ان کے لیے ساری اپنی گولٹیں لے لے کر کھڑا ہو جاؤں گا اور آپ کو منزل مقصود تک پہنچنے دوں گا۔“

اسد اللہ خان مسکرایا؟ ”یہ گولٹ تو پاؤ بارہ یا سات چھ تیرہ سے اس گھر میں پہنچتی ہے۔ رہی دوسری تو وہ کچے بارہ سے گھر میں جاتی ہے لودیکھو پھینکتا ہوں“

بنسی دھڑنے متنبہ کیا ”پانسہ نہ بنا کر پھینکنے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ اوپر تلے پانسے رکھ رہے ہیں۔“

اسد اللہ خان نے ہاتھ روک لیا اور بنسی دھڑ سے کہا ”اب روتے ہو“ پھر پانسہ پھینکا ”یہ پاؤ بارہ وہ مارا پاؤ بارہ لو کچے بارہ بھی لولو یہ کچے بارہ دیکھ لو کچے بارہ

دھڑے پڑے ہیں۔ یوں یہ پانسہ پھینکتے ہیں۔“

مرزا یوسف نے جو بغل میں بیٹھا تھا کہا ”بھائی جان! آپ کی پشت پر جوئی ہے جوئی“

اسد اللہ خان نے ذرا دون کی لی ”کہو، ہنسی دھڑچھ تین نو پھینکوں؟“

ہنسی دھڑ مسکرایا ”چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں“

اسد اللہ خان نے بڑی پھرتی سے پانسہ پھینکا پر چھ تین نو نہ آئے۔ اسی پانسے پر بازی رکی پڑی تھی کہ اتنے میں خولجہ غلام حسین صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اطلاع دی ”حضور! آپ کے نانا جان کی بری حالت ہے، دل پکڑے کرا رہے ہیں۔“

اسد اللہ سخت متحیر ہوا ”ارے بھئی ابھی ابھی تو میں ان کو ملا صاحب کے ساتھ اچھا بچھا چھوڑ کے آیا ہوں۔۔۔۔۔“ بازی کا خیال آیا تو زچ بچ ہو کر کہا ”اور یہاں بازی چھ تین نو پر رکی ہوئی ہے۔“

اسد اللہ خان اٹھنے لگا تو ہنسی دھڑ نے کہا ”مرزا نوشہ! اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں یا چھ تین نو پھینکتے جائیں یا ہار مان لیجئے“

اسد اللہ خان نے جواب دیا ”بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں تم یونہی بازی چکھی رہنے دو“ اور ملازم کے ساتھ چلا گیا۔ گھر پہنچا تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ خولجہ غلام حسین بعارضہ دل انتقال کر چکے تھے۔

اپنے نانا جان کے انتقال کے بعد اسد اللہ خان کی ابا بانی طبیعت اور زیادہ رنگ لائی۔ امراؤ نیگم کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔ آخر نواب احمد بخش اپنے چھوٹے

بھائی نواب الہی بخش خان معروف کے یہاں گئے اور کہا ”نواب احمد بخش مرزا  
نوشتہ نے اپنے نانا کے مرتے ہی نواب <sup>کلمہ</sup> پھڑے اڑانے شروع کیے ہیں میرے  
خیال میں اگر ان کا یہی عالم رہا تو جائیداد وغیرہ سب کنارے لگ جائے گی۔ جستجی  
اور بیٹی میں کیا فرق ہے جیسا مراؤ ڈیگم تمہاری بیٹی ویسی میری“

نواب الہی بخش نے باادب پوچھا ”تو پھر بھائی جان کیا کیا جائے؟“

نواب احمد بخش نے رائے دی ”یہ کیا جانے کہ تم مرزا نوشتہ کو اپنے پاس بلا لو اور  
اپنی نگرانی میں رکھو“ اور پھر تاکید کہا ”دیر نہ کرو جلدی جاؤ اور اس کو لے آؤ کہ اسی  
میں خیریت ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ جو اس کو اور مرزا یوسف کو ملتا ہے، وہ بھی  
چٹ کر جاتا ہے اور میں سنتا ہوں۔ ماں سے الگ لیتا ہے اور نانا کی جائیداد ملاک  
پر بھی ہاتھ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے۔ تم اس سے کہہ دینا کہ بھائی جان نواب  
احمد بخش صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ تم دلی چلے آؤ۔“

دونوں بھائیوں کے فیصلے کے مطابق مرزا۱۱۔۱۱۔۱۱ سدا اللہ خان کو آخر آگرہ چھوڑ کر دلی  
جانا پڑ گیا۔ جہاں اپنے خسر نواب الہی بخش خان معروف کی نگرانی میں اس کی  
زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

## غالب اور چودھویں

مرزا غالب اپنے دوست حاتم علی مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ”مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا اور اسے مار رکھا ہے۔“

1264ء میں مرزا غالب چوہدری کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعے کے متعلق ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں ”کوٹوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف فتنہ گمات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجودیکہ مجسٹریٹ کوٹوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوٹوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔“

افسانہ نگار کے لیے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں رومان کی از تکون تو ”ستم پیشہ ڈومنی“ اور کوٹوال دشمن تھا کے مختصر الفاظ مکمل کر دیتے ہیں۔

ستم پیشہ ڈومنی سے مرزا غالب کی ملاقات کیسے ہوئی آئیے ہم تخیل کی مدد سے اس کی تصویر بناتے ہیں۔

صبح کا وقت ہے مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ مرزا نوشہ ہوادار میں بیٹھا ہے جسے چار کبار لسنے جا رہے ہیں۔ مرزا نوشہ کی نشست سے پتہ چتا ہے کہ سخت افسردہ ہے۔ افسردگی کا باعث یہ ہے کہ اس نے مشاعرے میں اپنی بہترین غزل سنائی مگر حاضرین نے داد نہ دی۔ ایک فقط نواب شفیق نے اس کے کلام کو سراہا۔ صدرالدین آزرودہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی لیکن بھرے ہوئے مشاعرے میں



دو آدمیوں کی داد سے کیا ہوتا ہے۔ مرزا نوشتہ کی طبیعت اور بھی زیادہ مکدر ہوئی تھی۔ جب لوگوں نے ذوق کے کلام کو صرف اس لیے پسند کیا کیوں کہ وہ استاد شاہ تھا۔

مشاعرہ جاری تھا مگر مرزا نوشتہ اٹھ کر چلا آیا وہ اور زیادہ کوفت نہیں اٹھا سکتا تھا۔

مشاعرے سے باہر نکل کر وہ ہوادار میں بیٹھا کہا روں نے پوچھا ”حسنو، کیا گھر چلیں گے؟“ مرزا نوشتہ نے کہا نہیں، ہم ابھی کچھ دیر سیر کریں گے، ایسے بازاروں سے لے چلو جو سنسان پڑے ہوں۔

کہار بہت دیر تک مرزا نوشتہ وک اٹھائے پھرتے رہے، جس بازار سے بھی گزرے، وہ سنسان تھا۔ چودھویں کا چاند غروب ہونے کے لیے نیچے جھک گیا تھا۔ اس کی روشنی اداس ہو گئی تھی۔

ایک بہت ہی سنسان بازار میں ہوادار گزر رہا تھا کہ دور سے سارنگی کی آواز آئی بھیرویں کے سرتھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز آئی مرزا نوشتہ چونک پڑا اسی کی غزل کا ایک مطلع بھیرویں کے سروں پر تیر رہا تھا۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آوازیں درد تھا، جوانی تھی لیکن یہ مطلع ختم ہوتے ہی آواز ڈوب گئی۔

دور ایک کوٹھے پر ملکہ جان جمائیاں لے رہی ہے۔ چاندنی بچھی ہوئی ہے۔

اس کی سلوٹوں سے اور موتیے اور گلاب کی بکھری اور مسلی ہوئی پتیوں سے پتہ چتا ہے کہ محض رقص و سرود کو ٹھنڈے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔

ملکہ جان نے ایک لمبی جمائی لی اور اپنا ضعیف بدن جھٹک کر اپنی سانولی سلوٹی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی نوچی سے جو گاؤں تکیے پر سر رکھے اپنی خروٹی انگلیاں چٹا رہی تھی کہا ”مومن ہے، شیفٹہ ہے، آزرده ہے استاد شاہ ذوق ہے۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کل کے اس مبتدی شاعر غالب کے کلام میں کیا دھرا ہے کہ جب نہ تب تو اسی کی غزل گائے گی!“

نوچی مسکرائی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ایک سرد آہ بھر کر اس نے کہا

”دیکھنا“ اقریر کی لذت کو جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ملکہ جان نے پہلے سے بھی زیادہ لمبی جمائی لی اور کہا ”بھئی اب سو بھی چکو بہت راہ دیکھی جمعدار حشمت خان کی۔“

شوخی چشم نوچی نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر بازو اوپر سے لے جا کر ایک جمائی لیتے ہوئے کہا

”بس اب آتے ہی ہوں گے میں تو ان سے کہا تھا کہ مرزا غالب کے آگے سے جو نہیں منع ہے وہ ان کی غزل کی نقل لے کر چلے آئیں“

ملکہ جان نے برا سامنہ بنایا ”اس ٹکڑے مرزا غالب کے لیے اب تو اپنی نیندیں بھی حرام کرے گی تو“

نوچی مسکرائی سامنے فدن میاں سارنگی پر ٹھوڑی مکائے پینک میں اونگڑ رہا تھا۔

نوچی نے طنزورہ اٹھایا اور اس کے تارہولے ہولے چھیڑنا شروع کیے پھر اس کے حلق سے خود بخود اشعار راگ بن کر نکلنے لگے۔

نکتہ چیں ہے نم دل اس کو سنائے نہ بنے  
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
فدن میاں ایک دم چونکا آنکھیں مندی رہیں لیکن سارنگی کے تاروں پر اس کا  
گزر چلنے لگا

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل  
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے  
گانے والی کی تسکین نہ ہوئی چنانچہ اس نے شعر کو یوں گانا شروع کیا  
میں باقی تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل  
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے  
ملکہ جان ایک دم چونکا اس نے نوچی کو اشارہ کیا وہ بھی چونک پڑی سامنے  
دبلیز پر مرزا نوشہ ایستادہ تھا۔ ملکہ جان فوراً اٹھی اور تسلیمات بجا لائی نوچی نے بھی  
اٹھ کر کھڑے قد تعظیم دی، یہ جان کر کہ شہر کے کوئی رئیس ہیں۔ ملکہ استقبال کے  
لیے آگے بڑھی ”آئیے آئیے! تشریف لائی زہے قسمت کہ آپ ایسے رئیس مجھ  
غریب کو سرفراز فرمائیں آپ کے آنے سے میرا گھر روشن ہو گیا۔“

مرزا نوشہ نے حسن ملیح کے نادرنمونے کی طرف دیکھا نوچی نے جھک کر کہا  
”آئیے ادھر مسند پر تشریف رکھیے“

مرزا نوشہ ذرا تامل کے بعد بیٹھ گیا اور کہنے لگا ”تمہارا گلہا بہت سریا ہے اور



مرزا نوشہ مسکرایا ”بھاؤ بتا کے گاؤ تو کچھ بھاؤ کے انگلوں سے شاید سمجھ لوں“  
اب چودھتویں کو جگت سو جھسی، پچھلی سی ناک چڑھا کر کہا ”بھاؤ کا بھاؤ مہنگا  
پڑے گا“

مرزا نوشہ ایک لٹھلے کے لیے خاموش ہو گیا پھر چودھتویں سے مخاطب ہوا  
”آپ کو غالب کا کلام بہت پسند ہے؟“

ملکہ جان جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی۔ مرزا نوشہ سے مخاطب ہوئی ”حسنورا!  
کئی بار کہہ چکی ہوں اس سے کہ ذوق ہے، مومن ہے، نصیر ہے، شیفتہ ہے، سب  
مانے ہوئے استاد ہیں پر اسے نہ جانے اس عطائی غالب کے کلام میں کیا خاص  
بات نظر آتی ہے کہ آپ مومن کی فرمائش کریں گے اور یہ غالب شروع کر دے  
گی۔“

مرزا نوشہ نے مسکرا کر چودھتویں کی طرف دیکھا اور کہا ”ایسی کوئی خاص بات  
ہوگی؟“

چودھتویں سنجیدہ ہو گئی ”یہ تو وہی تجھے جس کو لگی ہو“  
مرزا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ”کیا میں سن سکتا ہوں وہ آپ کے دل کی لگی  
کیا ہے؟“

چودھتویں نے سرد آہ بھری ”نہ پوچھنے کہاں میں غریب ڈوٹھی کہاں  
غالب۔۔۔۔۔ جانے دیجئے اس بات کو۔۔۔۔۔ کہنے آپ کس کی غزل سنیں  
گے؟“

مرزا نوشہ مسکرایا ”غالب کی اور کہنے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے

چلوں۔ چودھتویں کے چاند کا برج اسد میں طلوع ہو جائے،  
چودھتویں اس کا مطلب نہ سمجھی ”مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے خاک ہو جائیں  
گے ہم ان کو خبر ہونے تک۔“

مشاعرے میں مرزا نوشہ کو جو کوفت ہوئی تھی۔ اب وہ بالکل دور ہو چکی تھی ان  
کے سامنے سانوے سانوے رنگ کی موٹی موٹی آنکھوں والی لڑکی بیٹھی تھی جس کو  
اس کے کلام سے والہانہ محبت تھی یہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ مرزا نوشہ بہت دیر  
تک گفتگو کرنے کے باوجود بھی نہ جان سکا۔ آخر میں مرزا نوشہ نے اس سے  
پوچھا ”کیا تم نے کبھی نالاب کو دیکھا ہے؟“

چودھتویں نے مختصر سا جواب دیا ”نہیں“  
مرزا نوشہ نے کہا ”میں انہیں جانتا ہوں بہت ہی بگڑے رئیس ہیں تم چاہو تو  
میں انہیں لاستا ہوں یہاں“

چودھتویں کا چہرہ متمتا اٹھا ”جج؟“  
مرزا نے کہا ”میں کوش کروں گا“ اور یہ کہہ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا ”میرا  
کلام سنو گی؟“

چودھتویں نے رسمی طور پر کہا ”سنائیے ارشاد“  
مرزا نوشہ نے مسکرا کر کاغذ کھولا ”یوں تو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں پر تمہیں تو  
نالاب کے کلام سے محبت ہے میرا کلام تمہیں کیا پسند آئے گا؟“

چودھتویں نے پھر رسمی طور پر کہا ”جی نہیں، کیوں پسند نہ آئے گا آپ ارشاد  
فرمائیے“

مرزا نوشہ نے ابھی اس غزل کے دو ہی شعر سنائے ہوں گے جو اس نے  
مشاعرے میں پڑھی تھی کہ چودھویں نے ٹوک کر پوچھا ”آپ اس مشاعرے  
میں شریک تھے جو مفتی صدرالدین آرزوہ کے یہاں ہو رہا تھا“

مرزا نوشہ نے جواب دیا ”جی ہاں“

چودھویں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ”غالب تھے؟“

مرزا نوشہ نے جواب دیا ”جی ہاں!“

چودھویں نے اور زیادہ اشتیاق سے کہا ”کوئی ان کی غزل کا شعر یاد ہو تو  
سنائیے؟“

مرزا نوشہ نے افسوس ظاہر کیا اور کہا ”اس وقت کوئی یاد نہیں آ رہا“

اس نے اب مذاق کو اور زیادہ طویل نہ دینا چاہا۔ ایک گلوری چودھویں کے  
باتھ کی بنی ہوئی لی۔ خاص دان میں ایک اشرفی رکھا اور رخصت چاہی۔

کوٹھے سے نیچے اتر اتو میڑھیوں کے پاس مرزا نوشہ کی مڈ بھیڑ جمعدار حشمت  
خان سے ہوئی جو مشاعرے سے واپس آ رہا تھا۔ حشمت خان اس کو دیکھ کر بھونچکا  
رہ گیا ”مرزا نوشہ آپ یہاں کہاں؟“

مرزا نوشہ خاموش رہا حشمت خان نے معنی خیز انداز میں کہا ”تو یہ کہنے کہ آپ  
کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر رہوتا ہے؟“

مرزا نوشہ نے مختصر سا جواب دیا ”فقط آج اور وہ بھی اتفاق سے خدا حافظ“

یہ کہہ کر وہ ہوادار میں بیٹھ گیا۔ حشمت خان اوپر گیا تو چودھویں دیوانہ وار اس  
کی طرف بڑھی ”کہئے غالب کی غزل لائے؟“





یہ کہہ کر اس نے غزل کا کاغذ کھول کر دیکھا اور سر پیٹ لیا ”اللہ یہ خواب ہے یا  
بیداری سچ ہے تو وہ غالب ہی تھے۔ سو میں غالب، ہزار میں غالب تھے۔ جمعدار  
صاحب! سچ کہا آپ نے ضرور غالب تھے۔ ہائے میں نے ان سے کہا آپ  
غالب کے کلام کو کیا سمجھیں میں مر جاؤں۔۔۔۔۔ بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں  
گے۔۔۔۔۔ ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ اف نہ معلوم میں کیا کیا ان  
سے کہہ گئی“

یہ کہتے کہتے اس نے غزل کا کاغذ منہ پر پھینکا اور رونے لگی۔

The End-----ختم شد